Registered No. L. 4186

جلد ۳۱ — رجب ۱۳۶۶ھ

عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دارالاسلام - جمال پور - پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

جلد ۳۱	رجب ۱۳۶٦ھ مطابق جون ۱۹۴۷ء	عدد ۱

☆

روداد اجتماع جماعت اسلامی

حلقہ جنوبی ہند

(مدراس، ریاست میسور اور ریاست حیدر آباد دکن)

☆

منعقدہ ۲۵ - ۲٦ اپریل ۱۹۴۷ء

بمقام مدراس

حلقہ جنوبی ہند بمقام مدراس

پہلا اجلاس | یہ اجلاس ۲۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو بروز جمعہ ٹھیک ۷ بجے بعد نماز جمعہ اجتماع گاہ کے پنڈال واقع پرمبور بیرکس میں شروع ہوا۔ یہ کھلا اجلاس تھا۔ صوبہ مدراس، ریاست حیدرآباد اور میسور کے ڈھائی سو سے زائد ارکان اور ہمدرد حاضر تھے۔ مقامی حضرات بھی کافی تعداد میں تشریف لائے تھے۔ مستورات کے لیے الگ انتظام کیا گیا تھا۔ کارروائی کا آغاز امیر جماعت کی افتتاحی تقریر سے ہوا جو درج ذیل ہے:۔

حمد و ثنا کے بعد فرمایا: رفیقو اور دوستو! اس سال جماعت کا اجتماع عام پٹنہ میں کرنا تجویز ہوا تھا۔ لیکن ہمارے اس فیصلے کے بعد ملک کے حالات یکایک بدل گئے اور ہمیں مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اجتماع عام کو منسوخ کر کے چاروں حلقوں کے الگ الگ اجتماعات منعقد کیے جائیں تاکہ آنے والے تغیرات کے آغاز میں ہم برسر موقع پہنچ کر اپنے رفقا کو مناسب اور ضروری ہدایات دے دیں۔ اگرچہ ان حلقہ وار اجتماعات کے بارے میں بھی اندیشہ تھا کہ کہیں کچھ غیر متوقع مشکلات پیش نہ آجائیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنے اس پروگرام میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

اس وقت ہندوستان جس تیزی کے ساتھ بدامنی اور تباہی کی طرف جا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتا کہ آئندہ کیسے کیسے اور کیسے حالات پیش آنے والے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے رفقا اپنی پوزیشن کو سمجھ لیں، اپنے فرائض کو جان لیں، اور اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس بیماری کی حالت میں اپنے اوپر جبر کر کے نکل آیا تاکہ موجودہ حالات کے بدلنے سے پہلے پہلے جو باتیں رفقائے جماعت تک پہنچانی چاہئیں وہ پہنچا دوں اور اپنی ذمہ داری سے خدا کے حضور بری الذمہ ہونے کی کوشش کر دوں۔

آپ ان حلقہ وار اجتماعات کی اہمیت کو سمجھیں۔ یہ دو تین دن جو آپ کو یہاں مل بیٹھنے کے لیے

ہیں اِن کا پورا پورا فائدہ اٹھایئے، اِن کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیجیے، اور کام ختم ہونے کے بعد واپس جاکر اپنے اپنے مقامات پر ہدایات کے مطابق عمل شروع کر دیجیے۔

اس کے بعد قیم جماعت نے جماعت کی سالانہ رپورٹ اور مرکزی بیت المال کے سالانہ حسابات پیش کیے جو اجتماع ٹونک کی روداد میں درج ہو چکے ہیں۔ پھر مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب قیم حلقہ مدراس نے اپنے حلقے کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔

دوسرا اجلاس اسی روز نماز مغرب کے بعد دوسرا اجلاس منعقد ہوا۔ یہ بھی کھلا اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں حاضرین کی تعداد چھ سات سو کے درمیان تھی۔ چونکہ امیر جماعت کو پہلے اجلاس میں مسلسل تین گھنٹے بیٹھنے سے بہت تکان اور گردے میں کچھ تکلیف بھی شروع ہو گئی تھی اس لیے وہ شریک نہ ہو سکے اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو اپنی نیابت کے لیے مقرر کر دیا۔ سب سے پہلے مولوی مظہر الدین صاحب صدیقی نے جماعت کی دعوت کو انگریزی میں لکھی ہوئی تقریر کے ذریعے پیش کیا۔ یہ تقریر الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دی جائے گی۔ پھر قیم جماعت نے حسب ذیل تقریر کی:

صاحب صدر اور معزز حاضرین! دنیا کا ہر مسلک اور نظام زندگی چند اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اپنے کچھ خاص مقتضیات و مطالبات رکھتا ہے۔ اُس مسلک کو ماننے اور قبول کرنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کے اِن مقتضیات اور مطالبات کو پورا کیا جائے۔ جن جن باتوں کو اختیار کرنے کا اس کے اصول تقاضا کریں، ان کو بلا تامل اختیار کر لیا جائے، جن جن امور سے وہ منع کریں ان کو بلا چون و چرا ترک کر دیا جائے، اور جس اور جیسے تغیر کا بھی وہ زندگی، اس کے معاملات اور تعلقات میں مطالبہ کریں وہ بلا تردد کر ڈالا جائے خواہ ایسا کرنے سے کتنے ہی بڑے نفع سے دستکش اور کتنے ہی بڑے نقصان سے دوچار ہونا پڑے۔ جو لوگ اس طرح کسی مسلک کو مانیں وہی دراصل اس کے اصلی اور سچے ماننے والے ہوتے ہیں، انھیں کے ذریعے سے وہ دنیا میں فروغ پا سکتا ہے اور اگر اسے بالفعل دنیا میں برپا کرنا ہو تو ایسے ہی لوگوں کا ایک مضبوط گروہ اس کے لیے درکار ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کوئی مسلک یا نظام زندگی دنیا میں برپا ہوا ہے ایسے ہی ماننے والے لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے۔ باقی رہے

وہ لوگ جو صرف زبانی جمع خرچ کرنے والے ہوتے ہیں، زبان سے تو اسے ماننے کا اقرار کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی اور اعمال و معاملات یہ شہادت دے رہے ہوتے ہیں کہ وہ نہ اس کے لیے اپنا کوئی نفع یا کوئی دلچسپی چھوڑنے کے لیے تیار ہیں اور نہ کوئی تکلیف یا کوئی نقصان ہی اٹھانے کے لیے آمادہ، تو ایسے منافق پیرو اس مسلک کے حق میں صریح منکروں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ اگر ماننے کا اقرار کرتے ہیں تو اپنے قول میں جھوٹے ہیں، اور ان کے اس عمل کی موجودگی میں ان کی تکذیب کے لیے کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ ان کا مقام خود اس مسلک کی رو سے اور اس کے سچے علمبرداروں کے نزدیک صریح منکروں سے بھی پیچھے ہے۔ وہ مار آستین اور چھپے دشمن ہیں جو دوستی کے روپ میں اندر ہی اندر جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ ایسے لوگ کسی جماعت یا پارٹی میں صرف اسی وقت تک پنپ سکتے ہیں جب تک کہ وہ ظاہر نہ ہوں یا پھر جماعت میں اس قدر جماعتی شعور یا ایسی تنظیم اور قوت موجود نہ ہو کہ ایسے لوگوں کو کاٹ پھینکے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کی وضاحت کے لیے اپنے اس ملک ہی میں رائج دو بڑے مسلکوں کو لے لیجیے۔ ان میں ایک "ہندوستانی قومیت" یا "وطن پرستی" کا مسلک ہے جو ملک کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی کے لیے دین اور دھرم کا قائم مقام بن گیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان نامی ملک اور اس میں بسنے والے لوگوں کی اکثریت کے مفاد کو دنیا جہان کی ہر شے پر مقدم رکھا جاتا ہے، یعنی جو لوگ اس مسلک کو ماننے کے دعویدار ہیں وہ اس ملک کو فائدہ پہنچانے اور اسے نقصان سے بچانے کے لیے ہر بازی کھیلنے کے لیے ہر وقت تیار رہیں قطع نظر اس سے کہ ایسا کرنے میں دوسرے ملکوں، قوموں یا خود اسی ملک کے بعض دوسرے چھوٹے گروہوں کو کتنا ہی بڑا نقصان پہنچتا ہو اور خواہ ایسا کرنا انسانی اور اخلاقی نقطہ نظر سے کتنا ہی گھناؤنا اور شرمناک فعل ہو۔ چنانچہ "وطن پرست" جماعتوں میں اسی جذبہ و عمل کے لوگوں کو جگہ مل سکتی ہے، اور اگر ان کے اندر اس طرح کا جذبہ و عمل موجود نہ ہو تو ان کے لیے ان جماعتوں میں جگہ پانا تو درکنار وہ ان کے باغی قرار پائے بغیر نہیں رہ سکتے خواہ وہ اخلاق و انسانیت اور سیرت و کردار اور دوسرے تمدنی معیارات کے

مخالف سے کتنے ہی بڑھ کر کیوں نہ ہوں۔ اس کی بے شمار مثالیں وطن پرست جماعتوں کے ہاں موجود ہیں۔ کسی حوالے کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح دوسرا مسلک "قوم پرستی" یا "نسلی قومیت" کا ہے۔ اسے قبول کرنے اور ماننے کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی قوم کے مفاد کو باقی تمام دنیا کے مفاد پر مقدم رکھا جائے، ہر اس کام کو بے دریغ کر ڈالا جائے جس سے اپنی قوم کو کوئی فائدہ پہنچتا ہو یا پہنچنے کی توقع ہو اور ہر اس کام کو بجبر روک دیا جائے جس سے اپنی قوم کو کوئی نقصان پہنچتا ہو یا پہنچنے کی توقع ہو، قطع نظر اس سے کہ اس سے دوسری قوموں اور ملکوں پر یا اخلاق اور انسانیت پر کتنا اور کیسا ہی اثر پڑتا ہو۔ "قوم پرستی" کا مستقل اصول یہ ہے کہ ہر وہ طریقہ اور کام جائز اور پسندیدہ ہے جس سے قوم کو کچھ بھی فائدہ پہنچتا ہو اور ہر وہ کام ناجائز اور غلط ہے جس سے قوم کو کوئی نقصان پہنچتا ہو۔ اس ملک میں اس کی بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ہیں، حتیٰ کہ خود مسلمانوں میں سے جو لوگ فی الواقع "قوم پرستی" کے اصول کو ماننے والے اور اس کے سچے علمبردار ہیں ان کے نزدیک بھی اگرچہ سود، شراب اور ناچ گانا سب مذہباً ناجائز اور حرام ہیں لیکن وہ مسلم بنک، مسلم انشورنس کمپنیاں، ملت آرٹ پروڈکشن اور دوسری فلم کمپنیاں اس لیے دھڑا دھڑ کھولے جا رہے ہیں اور شراب اور دوسری حرام چیزوں کے ٹھیکے اس لیے پوری ڈھٹائی کے ساتھ لیے اور دیے جا رہے ہیں کہ قوم کا مفاد اس وقت انھیں اسی میں دکھائی دیتا ہے۔ اسی "قوم پرستی" کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنی سیاست، معاشرت، معیشت اور زندگی کے اجتماعی معاملات میں کسی جگہ انھیں یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ جس دین کو ماننے کی وجہ سے وہ مسلمان قوم اور اپنے حقوق کے دعویدار بنتے ہیں وہ اس بارے میں کچھ ہدایات دیتا اور حدود معین کرتا ہے یا نہیں۔ اُن کے ہاں ہر اس شخص کے لیے نہ صرف ممبری اور لیڈری کی، بلکہ پیشوائی اور قیادت تک کی جگہ خالی ہے جس سے قوم کو کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع ہو قطع نظر اس سے کہ اس کی زندگی اور سارے معاملات اسلام کے بنیادی اصولوں تک کے بارے میں کیسی ہی شہادت پیش کر رہے ہوں اور قطع نظر اس سے کہ اس سے اسلام کو کتنا ہی بڑا نقصان پہنچ رہا ہو۔ یہ اس لیے کہ وہ "قوم پرست" ہیں اور

ان کے نزدیک قوم کا مفاد دنیا کی ہر دوسری شے پر مقدم ہے۔ وہ دین کو گرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں لیکن قوم کو کوئی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتے۔

حضرات۔ اسلام بھی جس پر میں اور آپ ایمان کے دعویدار ہیں، ایک مسلک ہے۔ اس کے کچھ اصول ہیں۔ یہ بھی اپنے کچھ معین معتقدات اور مقتضیات رکھتا ہے۔ دنیا کے دوسرے مسلکوں اور نظام ہائے زندگی کی طرح یہ بھی اپنے ماننے والوں اور علمبرداروں سے کچھ اپنی باتیں منواتا اور کچھ چیزیں اور طریقے چھوڑواتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگیوں اور معاملات وغیرہ کو بدل کر اس کے بتائے ہوئے سانچوں میں ڈھالیں۔ وہ ان سے تقاضا کرتا ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان میں واقعی صادق ہیں تو دنیا کی کسی دوسری شے کی اس کے اور اس کی تعلیمات کے مقابلے میں پرواہ نہ کریں، تمام ان کاموں کو بلا تامل کرتے چلے جائیں جن کے کرنے کا وہ حکم دے اور تمام ان چیزوں کو اپنی زندگیوں سے بلاچون وچرا خارج کر دیں جن سے وہ منع کرے۔ جس طرح دنیا کے دوسرے مسلک اصرار کرتے ہیں کہ ان کے پیرو اپنے ہر کام اور ہر معاملے میں ہر آن شہادت پیش کریں کہ وہ اپنے ایمان میں سچے اور اپنے اصول کے پکے ہیں، اسی طرح اسلام بھی اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو تو اپنی پوری زندگی، اس کے سارے معاملات اور اس کے تمام تعلقات سے یہ شہادت پیش کرو کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو سچ کہہ رہے ہو۔ اپنی انفرادی خاندانی، اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور اجتماعی زندگی اور اس کے ہر گوشے میں اپنے ایمان کے سچے گواہ بنو۔ اس بات کا ثبوت پیش کرو کہ تمھیں اسلام دنیا کی ہر چیز سے، اپنی ذات سے، اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندان سے، اپنی قوم اور قبیلے سے، اپنے ملک اور وطن سے بڑھ کر عزیز ہے۔ تم اپنے آپ کو، اپنے خاندان کو، اپنی قوم اور ملک کو اور پوری دنیا کو بھی خطرے میں ڈال سکتے ہو لیکن خدا کے دین کو خطرے میں پڑتے دیکھنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہے۔ ان کا بڑے سے بڑا نقصان گوارا کر سکتے ہو لیکن جیتے جی خدا کے دین کا کوئی نقصان گوارا کرنا تمہارے لیے ناممکن ہے۔ ایسے ہی لوگ خدا اور رسول کے نزدیک سچے مسلمان ہیں، انھیں کے ہاتھوں اسلام فروغ پا سکتا ہے

اور اگر کبھی پھر اسلام دنیا میں دین کی حیثیت سے برپا ہوا اور اس پر قرون اولیٰ کی سی بہار آئی تو ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں آئے گی۔

باقی رہے وہ لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ "وطن پرست" اور "قوم پرست" اور سوشلسٹ اور کمیونسٹ اور کیا کیا بھی بنتے ہیں تو یہ بیچارے یا تو اسلام ہی کو سرے سے نہیں سمجھے، یا پھر دوسرے مسلکوں کی ایجاب سے بھی ناواقف ہیں، یا پھر دونوں طرف سے کورے ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، ہر مسلک اپنے مخصوص مطالبات اور تقضیات رکھتا ہے اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آدمی بیک وقت دو مختلف اور باہم مخالف مسلکوں کے مطالبے اور تقاضے پورے کر سکے۔ لہٰذا جو شخص ایک ہی وقت میں دو ایسے مسلکوں کا پیرو بنتا ہے وہ لامحالہ ایک کا مومن اور دوسرے کا منافق، ایک کا وفادار اور دوسرے کا غدار بن کر رہے گا۔ یا پھر دونوں طرف کے لوگوں سے دھوکہ بازی کرے گا۔ بالخصوص "اسلام" تو چونکہ اپنے ماننے والوں کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے معین ہدایات دیتا ہے اور اس کا مطالبہ ہی اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً کا ہے، اس لیے ایک مسلمان تو ایک وقت میں بس مسلمان ہی ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں، اور اگر وہ کچھ اور بھی ہونے کا مدعی ہے تو پھر یقین کر لینا چاہیے وہ وہ مسلمان نہیں جو خدا اور رسول کو مطلوب ہے۔ ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے قول اور عمل سے کم از کم حسب ذیل چار بنیادی امور کی شہادت پیش کرے:-

(۱) یہ کہ خداوند عالم کے سوا وہ کسی کے لیے بھی اس زمین پر خدائی، ربوبیت اور حاکمیت کا حق تسلیم نہیں کرتا۔

(۲) یہ کہ وہ کسی ایسی امامت، پیشوائی، رہنمائی اور قیادت کو نہیں مانتا جو خدا اور رسول کی اطاعت و پیروی سے بے نیاز ہو۔

(۳) یہ کہ وہ کسی ایسے قانون کو جائز قانون اور کسی ایسے دستور کو جائز دستور نہیں مانتا جو خدا کی نازل کردہ ہدایت کو اپنا ماخذ اور مرجع تسلیم نہ کرتا ہو۔

(۴) یہ کہ وہ اپنے ہر قول و عمل اور ہر معاملہ کے لیے اپنے آپ کو خدا کے روبرو جوابدہ سمجھتا ہے۔

ان میں سے ہر چیز خدا پرستی کے سوا دوسری ہر "پرستی" کی جڑ کاٹ رہی ہے اس لیے کسی دوسری "پرستی" کا جوڑ اس خدا پرستی کے ساتھ کسی حال میں بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

یہی وہ امور ہیں جن کی طرف ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو متوجہ کرنے کے لیے یہ دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ ہم ان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی جگہ خود اپنی زندگیوں اور کوششوں کا محاسبہ کریں، اپنے معاملات کا، اپنے تعلقات کا، اپنی مصروفیتوں کا، اور اپنی شخصی اور قومی امنگوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ کس حد تک اسلام کے ان بنیادی اصولوں کے مطابق ہیں اور کہاں ان سے ہٹ گئے ہیں۔ مفتی اور قاضی آپ کے ایمان و اسلام کا اندازہ کرنے میں غلطی کھا سکتے ہیں، مگر آپ خود اگر خدا کو عالم الغیب اور علیمٌ بذات الصدور جانتے ہوئے اپنے قلب پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ کے اپنے ضمیر سے یہ بات نہیں چھپ سکتی کہ جس دین کو آپ اپنی دنیوی اور اخروی نجات کا ضامن مانتے ہیں اس پر آپ کے ایمان کا فی الواقع کیا حال ہے۔ یہ آپ کے زبانی دعوے اور یہ فلک شگاف نعرے انسانوں کو ممکن ہے مرعوب کر دیں اور انھیں کسی غلط فہمی میں بھی مبتلا کر دیں لیکن خدا کے ہاں تو سب حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ وہاں نعرے اور نام نہیں، نیتیں اور کام دیکھے جائیں گے۔ اسلام کا جو نمونہ آپ اس وقت دنیا میں پیش کر رہے ہیں اس کا نتیجہ تو بجز خسر الدنیا و الاٰخرۃ کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کے اس اسلام نے دنیا بھر کو اصلی اسلام سے بدگمان کر کے رکھ دیا ہے اور خدا کی کتاب گواہ ہے کہ ایسے اسلام کی آخرت میں بھی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ دوسرے مسلکوں اور نظام ہائے زندگی کی طرح اسلام بھی دو ہی صورتیں پیش کرتا ہے کہ یا تو اسے سارے کا سارا قبول کر دو یا پھر اس معاملے ہی کو ختم کر دو۔ یہ مسلمان اور نامسلمان ایک ساتھ بنتے رہنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں اور اگر آپ اس پر اصرار کریں گے تو پھر آپ سے پہلے کی مسلمان قوم یعنی یہودیوں کا انجام آپ کے سامنے ہے۔ اگر آپ اس انجام سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ خدا کے دین پر فی الواقع ایمان دیں اور اپنی زندگی اور اس کے معاملات سے، اپنے قول و عمل سے،

اور اپنی دوڑ دھوپ، اور نقل و حرکت سے اسلام کی سچی شہادت پیش کریں۔

اپنے غیر مسلم بھائیوں سے جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ "دین اسلام" نہ مسلمانوں کی ملکیت ہے اور نہ ان کے باپ دادا کی میراث۔ یہ تو سب انسانوں کے لیے زندگی کا ایک ہی صحیح راستہ ہے جو خدا نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے اتارا ہے۔ یہ کوئی نیا راستہ بھی نہیں۔ ابتدائے آفرینش سے جہاں بھی خدا کی طرف سے کوئی رہنمائی آئی اس میں یہی راستہ بتایا گیا تھا، یعنی یہ کہ انسان صرف خدا کے بندے اور اطاعت گذار اور تابعدار بن کر رہیں، بھلائیوں اور نیکیوں کو اختیار کریں، برائیوں سے بچیں، کسی پر ظلم و زیادتی نہ کریں، حقداروں کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کریں، کمزوروں اور بیکسوں کو سہارا دیں، خدا کی زمین کا خدا کی مرضی کے مطابق انتظام کریں تا آنکہ خدا کے نافرمان اور شریر لوگ اگر باقی بھی رہیں تو ذلیل بن کر باقی رہیں اور ان کی شرارت اور خباثت سے خدا کے وسیع بندے محفوظ ہوں۔ اس راستہ کا نام عربی میں اسلام ہے، دوسری زبانوں میں کچھ اور رہا ہوگا، مگر زبانوں کے فرق کے باوجود اس کی حقیقت ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ آپ لوگوں کے پاس بھی خدا کی طرف سے یہی دین اسی طرح بھیجا گیا تھا جس طرح دنیا کی دوسری قوموں کی طرف، اور جس طرح سب سے آخر میں اور اپنی مکمل صورت میں عربوں کی طرف بھیجا گیا۔ آپ نے اور دوسری قوموں نے جب اس کا کچھ حصہ ضائع کر دیا، کچھ دوسری چیزوں کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور جو باقی بچا اسے بھی پس پشت ڈال دیا تب یہ ایک ایسی امت کے پاس از سر نو بھیجا گیا جس نے اسے اور اس کے لانے والے کی سیرت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ لہٰذا یہ آپ کی اپنی ہی کھوئی ہوئی چیز ہے جو دوسروں کے ہاتھوں آپ کے پاس واپس آئی ہے۔ اسے پرائی چیز سمجھ کر ناک بھوں نہ چڑھائیے بلکہ خدا کا شکر ادا کیجیے کہ جو کچھ آپ نے کھویا تھا وہ پھر واپس مل رہا ہے۔ اگر آپ اس کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو قرآن میں دیکھیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کی زندگیوں میں دیکھیں۔ موجودہ مسلمانوں کی زندگی اور معاملات کو اسلام نہ سمجھ بیٹھیں۔ جس طرح آپ لوگ دین دھرم سے بے نیاز ہو کر وطنیت، قومیت اور دنیا پرستی میں گم ہو گئے ہیں اسی طرح یہ بھی اسلام کو پس پشت

ڈال کر انہی چیزوں میں گم ہو گئے ہیں اور ان کے ہاں اسلام کا مصرف بجز اپنے جلسوں اور جلوسوں میں ایک قومی نعرے کی حیثیت سے استعمال کرنے کے اور کچھ نہیں رہا ہے۔ آپ اسلام کا کھلے دل سے مطالعہ کیجیے۔ اسے ہر حیثیت سے جانچیے اور پرکھیے۔ ہم نے اسے ایک سسٹم کی حیثیت سے اس کی اصلی شکل میں پیش کیا ہے۔ اگر آپ اسے سمجھنے کے لیے تیار ہوں تو ہم آپ کی اس بارے میں ہر مدد کے لیے تیار ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ سوشلزم، کمیونزم، نازی ازم اور فاشزم اور دنیا کی ہر تحریک کا کھلے دل سے مطالعہ کرتے اور اس کے حسن و قبح کی بنا پر اس پر غور کرتے ہیں لیکن اسلام کے معاملے میں تعصب کی عینک چڑھا لیتے ہیں اور یہ صرف اس لیے کہ جن لوگوں سے آپ کی ایک رت سے سیاسی کشمکش ہے وہ اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ "اسلام" خدا کا دین ہے اور اس کے بندوں کے لیے اسی طرح نعمت ہے جس طرح اس کی ہوا، پانی، اناج پھل پھول، بارش اور خدا کی پیدا کردہ زمین و آسمان کی باقی ساری چیزیں۔ جب آپ ان نعمتوں کے استعمال سے اس لیے ہاتھ نہیں کھینچتے کہ مسلمان بھی ان کو استعمال کرتے ہیں تو آخر اس نعمت سے محض مسلمانوں کی ضد میں کیوں بھاگتے ہیں۔ میرے عزیز بھائیو! یہ شیطان کا بہت بڑا فریب ہے۔ وہ انسان کو حق سے روکنے کے لیے مختلف قسم کی رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ آپ اس کے اس فریب میں مبتلا ہو کر اپنی دنیا اور آخرت خراب کر رہے ہیں۔ ہم خدا کے دین کو آپ کے روبرو پیش کرتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے جو ہمارے اور آپ کے رب نے ہمارے ذمے لگایا ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کو یہ حکم دیا ہے کہ نیکی اور بھلائی کی ہر بات جو انھیں معلوم ہو اسے اپنے دوسرے بھائیوں تک پہنچائیں تاکہ وہ بھی ان سے مستفید ہوں اور دنیا سے برائی ختم ہو۔ جب مرنے کے بعد آپ خدا کے روبرو پیش ہوں گے تو آپ سے پوچھا جائے گا کہ میرے کچھ بندوں نے میرا دین آپ کے روبرو پیش کیا، آپ کو اس پر غور کرنے کی دعوت دی لیکن آپ نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ فرمائیے اس کا آپ کیا جواب دیں گے؟ یہ دن آنے والا ہے اور اس کے آنے میں قلب کی ایک حرکت کے سوا کوئی شے حائل نہیں۔

مجھے امید ہے کہ میرے مسلمان اور غیر مسلم بھائی میری ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

اجتماع مدراس کے بعض ناخوشگوار واقعات

جو لوگ ہمارے طریق اور مسلک سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارا شیوہ دوسرے افراد یا جماعتوں سے خواہ مخواہ لڑنے جھگڑنے کا نہیں ہے اس لیے ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے مدراس کے حلقہ وار اجتماع کے موقع پر وہاں کے بعض غیر ذمہ دار شورہ پشت لوگوں نے جو بدمزگی پیدا کرنے کی کوشش کی اسے ریکارڈ میں لائیں۔ لیکن عوام کی ان افسوسناک حرکات کے بعد مدراس کے بعض ذمہ دار رہنماؤں اور کارکنوں نے جو روش اختیار کی اور شرارت پھیلانے والے لوگوں کی جس طرح علانیہ تائید کی اور جماعت اسلامی کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے کی جو کوشش کی اس کی وجہ سے یہ ناگزیر ہوگیا ہے کہ ہم مدراس کے اس پورے واقعہ کو مختصراً ٹھیک ٹھیک بیان کردیں۔

اجتماع کے پہلے اجلاس میں جماعت کی سالانہ روداد سنائی جا رہی تھی کہ ۴ بجے شام کے قریب چالیس پچاس آدمیوں پر مشتمل ایک گروہ مسلم لیگ کا جھنڈا لیے ہوئے نعرے بلند کرتا ہوا اجتماع گاہ کے صدر دروازے پر آکر رکا اور اس نے نعروں اور دوسرے طریقوں سے اسقدر شور مچانا شروع کیا کہ باوجود لاؤڈ سپیکر کے مقرر کی آواز سامعین تک پہنچنی مشکل ہوگئی۔ امیر جماعت نے جو اس وقت اجلاس کے صدر تھے قیم صاحب کو رپورٹ بند کردینے اور شرکاء اجتماع کو بالکل خاموش اور پر امن رہنے کے لیے کہا اور اجتماع گاہ میں کامل خاموشی چھاگئی۔ باہر سے آنے والا گروہ بدستور شور کرتا رہا۔ کچھ آدمی اجتماع گاہ میں بھی داخل ہوئے اور انھوں نے ابتری پھیلانے کی کوشش کی اور کچھ لوگ اجتماع گاہ کے صدر دروازے پر چڑھ گئے اور انھوں نے دروازہ پر مسلم لیگ کا جھنڈا لگادیا۔ اس پر جماعت کے جو کارکن دروازہ پر موجود تھے انھوں نے اس گروہ کے لیڈروں سے کہا کہ "بھائی۔ اگر یہ جھنڈا لگانے ہی کی بات تھی تو اس قدر ہنگامہ آرائی کی کیا ضرورت تھی۔ آپ ہمیں کہتے تو ہم خود سے لگا دیتے۔ اب اندر تشریف لے چلیے اور کارروائی سنیے"۔ چنانچہ

یہ سب لوگ اجتماع گاہ میں بیٹھ گئے اور اجلاس کی کارروائی پھر شروع ہوئی۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ اس ہنگامے کے دوران میں پولیس کی گارد نے جو اپنے انتظامات کے سلسلے میں آئی ہوئی تھی کئی مرتبہ دخل انداز ہونے کی کوشش کی لیکن ہمارے کارکنوں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اپنے اجتماع میں امن قائم رکھنے کے ہم خود ذمہ دار ہیں، آپ سے ہم کوئی مدد نہیں لینا چاہتے، آپ ہمیں اپنے طریقے پر کام کرنے دیں۔

دوسرے اجلاس میں مولوی مظہر الدین صاحب اور قیم جماعت کی تقریریں تمام حاضرین نے جن کی تعداد پانچ چھ سو تھی نہایت صبر اور خاموشی سے سنیں۔ جب قیم جماعت کی تقریر جو اوپر درج ہو چکی ہے، ختم ہوئی تو مسلم لیگ کے ایک سرکردہ کارکن ڈاکٹر نعمت اللہ صاحب نے حسب ذیل سوال چٹ پر لکھ کر قیم جماعت کو دیا:

"کیا اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ایک وقت میں نہیں کی جا سکتی۔ اگر نہیں تو کیوں؟"

اس کے ساتھ ہی ایک مسلم لیگی عالم دین نے جو بہت بزرگ صورت اور عمر رسیدہ تھے حسب ذیل سوال لکھ کر قیم جماعت کو جواب کے لیے دیا:

"اگر ہم کسی فاسق و فاجر شخص کو اپنا رہنما بنا لیں تو کیا ہم جہنم میں جائیں گے؟"

ان دونوں سوالوں کو ہاتھ میں لے کر قیم جماعت مائیکروفون پر ابھی آکر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ دو تین سو آدمی یکدم اجتماع گاہ میں کھڑے ہو گئے اور انھوں نے "مسلم لیگ زندہ باد"، "قائد اعظم زندہ باد"، "پاکستان زندہ باد" اور "جمعیۃ العلماء مردہ باد" کے نعرے بلند کرنے شروع کر دیے اور اس قدر غل مچایا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ قیم جماعت نے لاؤڈ سپیکر کی مدد سے تمام ارکان اور ہمدرد حضرات کو تلقین کی کہ وہ بالکل خاموش اور پرامن رہیں، بلوائیوں کے کسی قول و فعل کا نوٹس نہ لیں، نہ ان کی کسی حرکت کا کوئی جواب دیں، جماعت اسلامی دنیا میں امن و امان قائم کرنے اور فساد کو مٹانے کے لیے اٹھی ہے، فساد مچانے کے لیے نہیں اٹھی، اگر خدانخواستہ بلوائیوں کے ہاتھ سے کسی کو چوٹ بھی آجائے تو اسے اس کو صبر سے برداشت کرنا چاہیے۔ فساد کو

روکنے کے لیے جان دے دینا بزدلی نہیں، بہادری ہے۔ ہم انبیائے کرام کے مشن کو لے کر کھڑے ہوئے ہیں، ہمیں دنیا کو اخلاق کا سبق دینا ہے، ہمیں اپنے پیشوا کی طرح پتھروں کا جواب دعائے خیر سے دینا ہے اس لیے اپنے جذبات پر قابو رکھیے۔" چنانچہ تمام ارکان اور ہمدرد حضرات اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے اور قطعاً کوئی جوابی حرکت نہ کی۔ پھر بلوائیوں نے سٹیج کی طرف آگے بڑھنا شروع کیا اور ادھر ادھر کچھ جوتے بھی پھینکے۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر نعمت اللہ صاحب نے اسٹیج پر پہنچ کر بلوائیوں کو امن کی تلقین کرنی چاہی، لیکن انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خدا اور رسولؐ، اور مسلم لیگ اور قائد اعظم ہر ایک کا واسطہ دے کر کہا کہ میری بات تو سن لو، میں لیگ کا کارکن ہوں، اس کے لیے قربانیاں کر چکا ہوں، پاکستان کے لیے جان دینے کو حاضر ہوں لیکن سب بے سود۔ بلوائی بدستور ہنگامہ برپا کرتے رہے۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے لیگ کے نعرے لگانے شروع کیے اور جب انھیں سن کر مجمع ذرا خاموش ہوا تو انھوں نے کہا کہ "یہ جمعیۃ العلما کا جلسہ نہیں ہے بلکہ جماعت اسلامی کا اجتماع ہے جو اسلام اور پورے اسلام کی علمبردار ہے اور جس کا مقصد نظام اسلامی کا قیام ہے۔ میں نے مقرر کو سوال لکھ کر دیا ہے اس کا جواب انھیں دینے دیجیے اور جو وہ کہنا چاہتے ہیں اسے سنیے۔" اتنی بات ہی ڈاکٹر صاحب کہنے پائے تھے کہ ان لوگوں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا اور پہلے سے بھی زیادہ ہنگامہ برپا کیا۔ اب ایک اور لیگی کارکن، جو شاید کسی حلقہ کی لیگ کے صدر یا سکریٹری تھے، اسٹیج پر تشریف لائے اور انھوں نے بھی وہ تمام تدبیریں اپنے لوگوں کو خاموش کرنے کی کیں جو وہ کر سکتے تھے لیکن لاحاصل۔ آخر انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "میں پاکستانی ہوں۔ یہ ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ جو اس کی مخالفت کرے گا وہ ہمارا دشمن ہے، ہم اسے پیس ڈالیں گے وغیرہ وغیرہ"۔ اس سے بلوائیوں کا جوش ذرا ٹھنڈا ہوا تو انھوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ذرا صبر کریں اور اپنے لیڈر کے سوال کا جواب سنیں۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ بیٹھ گئے، کچھ کھڑے دیکھتے رہے لیکن اجتماع گاہ میں کافی حد تک خاموشی پیدا ہو گئی۔ اس پر قیم جماعت نے حسب ذیل مختصر تقریر کی، اور اجلاس برخاست کر دیا:

"میرے عزیز بھائیو! مجھے یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوا کہ آپ میں کچھ بھی صبر و تحمل موجود نہیں اور آپ اپنی خواہشات اور جذبات سے اس درجہ مغلوب ہیں کہ آپ کو اپنے، اپنی قوم کے اور اپنے دین و مذہب کے وقار کا بھی کوئی خیال نہیں رہتا۔ آپ کو سوچنا چاہیے کہ آپ نے گزشتہ آدھ پون گھنٹہ میں جو حرکات کی ہیں وہ کس اصول اخلاق و تہذیب اور معیار شرافت کی رو سے صحیح کہی جا سکتی ہیں۔ آپ کے سامنے کچھ باتیں کہی گئیں اور آپ کو اس کا موقع دیا گیا کہ ان کے متعلق اگر آپ کو کچھ اعتراض ہو یا آپ کے دل و دماغ میں کوئی شک و شبہ پیدا ہوا ہو تو اسے بلا تکلف پیش کیجیے، چنانچہ آپ کے دو معزز کارکنوں نے دو سوال لکھ کر دیے بھی۔ لیکن بجائے اس کے کہ آپ ان سوالوں اور ان کے جوابات کو سنتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے آپ نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو کسی بات کے معقول یا غیر معقول ہونے سے کوئی بحث نہیں۔ آپ کی خواہش کی پیروی ہونی چاہیے خواہ وہ جائز اور معقول ہو یا اس کے خلاف۔ آپ غور کیجیے کہ کیا اس طرز عمل کے ساتھ آپ کے لیے دنیا میں پنپنے اور ترقی کرنے کا کوئی موقع ہے؟ آپ میں کوئی برائے نام نظم و ضبط بھی موجود نہیں۔ ہر شخص اپنا آپ لیڈر بن گیا ہے، اور اپنی خواہشات اور جذبات کا اس قدر غلام ہو گیا ہے کہ جن لوگوں کو اس نے خود اپنا لیڈر منتخب کیا ہے ان کی بھی بات ماننے کے لیے وہ تیار نہیں۔

خیر اس امر سے مجھے کچھ خوشی بھی ہوئی کہ آخر آپ لوگوں نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ ابھی اخلاقی حس بالکل ختم نہیں ہوئی ہے۔ اگر اس کی پرورش کی جائے تو اسے دوسرے جذبات پر غالب کیا جا سکتا ہے۔ اب پیشتر اس کے کہ سوالات کے بارے میں میں کچھ عرض کروں میں یہ بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری دعوت اسلام اور خالص اسلام کی طرف ہے، ہم نہ اس میں کوئی کمی کرتے ہیں اور نہ کسی چیز کا اضافہ، کیونکہ ہمیں یا کسی دوسرے کو اس کا کوئی اختیار نہیں۔ ہم جو چیز پیش کرتے ہیں کتاب و سنت کی سند سے پیش کرتے ہیں اس لیے ہم پر اور ہماری دعوت پر جو اعتراض کیا جائے کتاب و سنت کی سند اور دلیل ہی سے

کیا جانا چاہیے۔ اور ہمارے جواب کو بھی اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔ اگر کسی کے نزدیک یہ معیار قابل قبول نہیں تو اس کے لیے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بات بھی بالکل کھلے لفظوں میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم اسی دعوت کے لیے جینے اور مرنے کا تہیہ کر چکے ہیں، دنیا کی کوئی قوت نہ اس سے ہمیں ہٹا سکتی ہے اور نہ مرعوب کر سکتی ہے۔ ہاں دلیل و برہان اور کتاب و سنت کو ساتھ لے کر میدان میں آیئے۔ اگر آپ اس راہ کو خدا اور رسول کی تعلیم کی رو سے غلط ثابت کر دیں تو ہم نہ صرف اسے ترک کر دیں گے بلکہ اپنی غلطی کا اسی اسٹیج سے اعلان کریں گے اور آپ کے شکر گزار ہوں گے کہ آپ نے ہمیں صحیح راہ دکھائی۔ لیکن اگر کوئی یہ خیال کرے کہ محض دنگہ اور فساد اور شور کر کے وہ ہمیں راہ حق سے پھیر دے گا تو یہ اس کی غلط فہمی ہے جسے جلد سے جلد دور ہو جانا چاہیے۔

اب آپ کے سوالات کے بارے میں یہ عرض ہے کہ کل مغرب کے بعد خطاب عام کے لیے جلسہ کیا جا رہا ہے جس میں ہماری جماعت کے امیر اپنی دعوت کو آپ حضرات کے سامنے پیش کریں گے اور آپ کے لیے موقع ہوگا کہ جو اور جس قدر سوالات اور اعتراضات و شبہات آپ پیش کرنا چاہیں کریں۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ یہ سوالات بھی میں انہی کو دیدوں اور کل وہ اپنی تقریر میں ان کو بھی صاف کر دیں۔ اس سے آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ مستند اور مدلل اور اطمینان بخش جواب مل جائے گا۔ ممکن ہے کہ میرے جوابات سے آپ کی تشفی نہ ہو اور بات پھر وہیں کی وہیں رہے اس لیے اب یہ اجلاس ختم کیا جاتا ہے۔"

اس کے بعد بلوائیوں نے پھر ہنگامہ برپا کرنا شروع کیا، جلسہ گاہ سے نکل کر خوردو کچن میں گھس گئے، تقریباً پچاس آدمیوں کا کھانا لوٹ کر لے گئے اور نہایت بے حیائی کے ساتھ ٹھٹھے مارتے ہوئے شارع عام پر دو رویہ کھڑے ہو کر اس لوٹے ہوئے کھانے کو کھاتے رہے۔

اس ہنگامے کے دوران میں پولیس کی گارد نے اپنی امداد کے لیے ایک لاری پولیس کی اور منگوائی اور بار بار چاہا کہ دخل انداز ہوں، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے کارکنوں کو بزدلی کا طعنہ

بھی دیا اور کہا کہ تم عجیب لوگ ہو کہ تمھیں اپنی عزت کی بھی پروا نہیں، تمھاری اسقدر توہین کی جا رہی ہے اور تم الٹے ہمیں مداخلت سے روک رہے ہو۔ لیکن جماعت کے کارکن برابر ان سے یہی کہتے رہے کہ آپ کے دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ یہاں کوئی فساد نہ ہوگا کیونکہ فساد ہمیشہ جوابی کارروائی سے ہوا کرتا ہے اور ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ یہ لوگ خواہ کچھ کریں ہم ان کے جواب میں کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ ہم اس کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اپنے بھائیوں پر آپ سے لاٹھیاں اور گولیاں چلوائیں۔

گیارہ بجے کے قریب جب بلوائی منتشر ہوئے اور بالکل امن ہو گیا اور کسی خرابی کا اندیشہ باقی نہ رہا تب صدر اجلاس مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور قیم جماعت سٹیج سے اٹھے اور اپنی قیامگاہ کو چلے گئے۔

قیم جماعت نے اس واقعہ کی پوری رپورٹ امیر جماعت کو دی اور انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ہم لوگوں کی خدمت اور اصلاح کے لیے آئے ہیں، ان کو فساد میں مبتلا کرنے نہیں آئے اس لیے اجتماع گاہ کو چھوڑ دیا جائے اور کل کی ساری کارروائی میری قیام گاہ (کوٹھی مولوی نذیر حسین صاحب قصوری) پر ہو۔ نیز کل خطاب عام کا جلسہ بھی موقوف کر دیا جائے کیونکہ ہم زبردستی اپنی بات لوگوں پر ٹھونسنا نہیں چاہتے۔ اگر اہل مدراس سننے کے خواہشمند نہیں ہیں تو ہمیں بھی انھیں سنانے پر اصرار نہیں۔

اگلے روز (۲۶ اپریل کو) ایک صاحب جن کا نام غالباً عبدالحفیظ صاحب تھا امیر جماعت کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ مجھے اور دوسرے فہمیدہ مسلمانوں کو کل کے واقعات سے بہت تکلیف ہوئی اور ہم سخت نادم ہیں کہ مدراس کے عوام نے ایسی اخلاق سوز حرکات کیں۔ خود مسلم لیگ کے لیڈر اسے محسوس کر رہے ہیں اور یہ معلوم کر کے کہ آپ نے آج اپنی خطاب عام کی تقریر کا پروگرام منسوخ کر دیا ہے سب پڑھے لکھے لوگ افسوس کر رہے ہیں۔ آپ کا لٹریچر عرصے سے مدراس میں پھیل رہا ہے، اور بہت مدت سے ہمیں آرزو تھی کہ آپ کی دعوت کبھی آپ کی زبان سے بھی سننے کا موقع ملے۔ اب اللہ تعالیٰ یہ موقع لایا تھا کہ کچھ شریر لوگوں نے یہ صورت حال پیدا

کردی - آپ ہمیں اس موقع سے محروم نہ کیجیے، ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اب پھر ایسی صورت پیش نہیں آئے گی۔

اس پر امیر جماعت نے فرمایا "آپ کو معلوم ہے کہ ڈھائی تین سال سے میں گردے کی سخت تکلیف میں مبتلا ہوں۔ ابھی پچھلے اکتوبر ہی میں میں نے آپریشن کروایا تھا لیکن اس کے بعد پھر مرض عود کر آیا۔ اس وقت میں قطعاً اس قابل نہیں تھا کہ اتنا لمبا سفر اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے بغیر کر سکوں، لیکن حالات کی نزاکت اور احساس فرض کی بنا پر اسی حال میں گھر سے نکل کھڑا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی جو اور جتنی روشنی مجھے عطا فرمائی ہے اسے اپنے بھائیوں تک پہنچانے کی کوشش کروں، اور انھیں یہ سمجھاؤں کہ بحیثیت مسلمان اور امت مسلمہ کے ان کے فرائض کیا ہیں اور وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن مدراس کے مسلمانوں نے کل اپنے طرزِ عمل سے یہ بتا دیا کہ وہ میری باتیں نہیں سننا چاہتے۔ اس لیے میں نے خطاب عام کا پروگرام منسوخ کر دیا۔ یوں تو جو لوگ میری بات سننا چاہیں انھیں سنانے پر مجھے بھی کوئی اصرار نہیں۔ جہاں تک میرے دینی فرض کا تعلق تھا وہ میں نے ادا کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہیں اور میری بات سننا چاہتے ہیں تو بسم اللہ، میں خدمت کے لیے حاضر ہوں لیکن مسلم لیگ کے مقامی لیڈروں کی طرف سے مجھے یقین دلایا جانا چاہیے کہ وہ اپنے زیرِ اثر عوام کو قابو میں رکھیں گے۔ مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں لیکن میں خدا کے دین اور انبیاء کی دعوت کی توہین کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتا، خصوصاً جب کہ اس کے مرتکب مسلمان ہوں۔"

عبدالحفیظ صاحب یہ پیغام لے کر چلے گئے۔ اس کے بعد دن میں اور بھی کئی سرکردہ لوگ تشریف لائے اور انھوں نے بھی حفیظ صاحب ہی کی طرح افسوس کا اظہار کیا اور امیر جماعت نے انھیں وہی جواب دیا جو حفیظ صاحب کو دیا تھا۔ اور ساتھ ہی انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ موجودہ قومی تحریک میں مسلمانوں کی عام اخلاقی حالت جس قدر گر گئی ہے یہ درحقیقت ایک نہایت تشویش ناک حالت ہے۔ قومی بیداری کے نام سے ان کے اندر کچھ خواہشات

تو پیدا کر دی گئی ہیں اور ان کے جذبات بھی بھڑکا دیے گئے ہیں، مگر نہ ان کی اخلاقی تربیت کی گئی نہ ان میں کوئی ضبط پیدا کیا گیا، اور نہ ان کے اندر کوئی سمجھ بوجھ پیدا کی گئی۔ عوام الناس کو اس قدر خودسر اور بے لگام بنا دینا ہر لحاظ سے نہایت خطرناک ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں کسی وقت یہ ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جس کا خمیازہ شہر مدراس ہی کے مسلمانوں کو نہیں بلکہ پورے جنوبی ہند کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑے۔ اگر یہ لوگ اسی راہ پر چلتے رہے تو بہت جلد یہ کسی خوفناک حادثے سے دوچار ہوں گے۔ ان کا اپنے منتخب کردہ لیڈروں تک کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرنا سخت تشویشناک صورت حال ہے۔ آپ لوگوں کو اس طرف جلد از جلد توجہ کرنی چاہیے۔ اگر آپ نے اس کی جلدی اصلاح نہ کی تو میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک دن آپ کے یہی پیرو خود آپ لوگوں کی پگڑیاں اچھالیں گے اور آپ ان کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوں گے۔ عوام کا معاملہ آگ اور پانی کا سا ہوتا ہے کہ اگر ان پر قابو اور کنٹرول نہ رکھا جائے تو یہ اپنے گھر کو بھی اسی طرح برباد کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے کے گھر کو۔"

ان سب باتوں کے باوجود ہم سخت افسوس اور رنج کے ساتھ اس امر کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں کہ بجز سیٹھ سر محمد جمال صاحب کے بہت کم لوگ ایسے تھے جن کو اس صورت حال پر فی الواقع افسوس ہوا ہو۔ ان میں سے اکثر تو اس بات پر فخر کر رہے تھے کہ مدراس کے مسلمانوں کے اندر مسلم لیگ سے اس قدر گہرا تعلق پیدا کر دیا گیا ہے کہ اب وہ مسلمانوں میں کسی دوسری جماعت کے وجود کو گوارا ہی نہیں کر سکتے خواہ اس کی دعوت کیسی ہی حق اور صحیح ہو۔

اسی روز مغرب سے چند منٹ قبل مسلم لیگ کے چھ سات لیڈر جن میں مسٹر کے۔ ٹی شریف صاحب سکریٹری مسلم لیگ، مسٹر عطاء اللہ صاحب (ایم۔ ایل۔ اے سنٹرل)، مسٹر عبد الحمید صاحب ایم۔ ایل۔ اے لیڈر مسلم لیگ اسمبلی پارٹی اور وہ بزرگ بھی شامل تھے جنھوں نے رات کے اجلاس میں سوال نمبر ۲ تحریر کر کے دیا تھا، تشریف لائے اور قیم جماعت سے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ قیم جماعت اجتماع کے اجلاس سے اٹھ کر ان سے ملنے کے لیے گئے۔ تعارف کے بعد مسٹر شریف صاحب نے امیر جماعت

کے خطاب عام کی تقریر کے پروگرام کے بارے میں دریافت کیا اور قیم جماعت نے وہی باتیں ان کے سامنے پیش کر دیں جو امیر جماعت نے عبدالحفیظ صاحب سے کہی تھیں اور ان سے کہا کہ اب اس تقریر کا ہونا یا نہ ہونا آپ لوگوں کی مرضی اور خواہش پر ہے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اجتماع گاہ میں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا اور اس قدر شور مچا کہ امیر جماعت کی قیام گاہ میں، بھی جہاں آج کے اجتماع کی کارروائی ہو رہی تھی، کام کرنا مشکل ہو گیا۔ ہم نے اپنے کارکنوں کو کہلوا بھیجا کہ وہ کوئی جوابی کارروائی نہ کریں بلکہ نوجوانوں کی ہر بیہودگی اور زیادتی کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں کیونکہ ہم انھیں معذور سمجھتے ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں ان کی باگڈور ہے انھوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ انھیں کسی اخلاق اور نظم و ضبط کی تربیت دینے کی بھی ضرورت ہے۔ جو ان بیچاروں نے سیکھا ہے وہی کچھ وہ کر رہے ہیں۔ آپ وہ کیجیے جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی قیم جماعت نے مسلم لیگ کے مذکورہ لیڈروں سے درخواست کی کہ پہلے آپ جا کر اپنے لوگوں کو قابو میں لانے کی کوشش کریں کیونکہ اس کے بغیر نہ آپ کچھ فیصلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہم۔

یہ سب لیڈر صاحبان اجتماع گاہ میں تشریف لے گئے۔ بلوائیوں نے پورے اجتماع گاہ میں مسٹر جناح کی بیسیوں تصویریں لٹکا رکھی تھیں۔ ہر طرف ابتری مچا رہے تھے اور اوباشی کا وہ مظاہرہ کر رہے تھے کہ الامان و الحفیظ۔ ان کے لیڈروں نے کوئی گھنٹہ بھر کی مسلسل جدوجہد اور دوڑ دھوپ کے بعد ہجوم کو ذرا قابو میں کیا اور ان کے جذبات کو اپیل کرنے کے لیے کچھ نعرے بلند کیے۔ ایک دو تقریریں بھی کیں اور انھیں بتایا کہ آپ نے سٹیج کو تو فتح کر لیا ہے، اب بتایئے کہ مولانا مودودی صاحب کی تقریر سننا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر آپ چاہیں تو وہ تقریر کریں گے اور نہیں چاہیں گے تو نہیں کریں گے۔ اس کے جواب میں ہجوم نے جس کی تعداد چھ سات سو تھی جواب دیا کہ ہرگز نہیں سنیں گے۔ اس پر لیڈر صاحبان نے انھیں منتشر ہو جانے کے لیے کہا۔ لیکن ہجوم اس کے بعد بھی دیر تک شور مچاتا اور ہنگامہ برپا کرتا رہا۔ اگلے روز جب اجتماع گاہ کے سامان کا جائزہ

لیا گیا تو بہت سے برتن اور چٹائیاں غائب تھیں۔

اس ہنگامے کے وقت بھی پولیس بہت بڑی جمعیت میں موجود تھی اور اس نے کافی وسیع انتظام کر رکھا تھا، کیونکہ صبح سے ہی یہ مشہور تھا کہ آج بلوائی فساد کی تیاری کر کے آئیں گے اور اجتماع گاہ کو آگ لگائیں گے۔ لیکن پولیس کے شدید اصرار کے باوجود جماعت کے کارکنوں نے انھیں دخل انداز ہونے سے منع کیا اور ان سے کہا کہ جو لوگ جذبات کے جوش میں آ کر پاگل ہو گئے ہوں اور اپنا توازن کھو چکے ہوں، ان پر لاٹھیاں اور گولیاں چلانا ظلم اور زیادتی ہے۔ ہمیں ان پر غصہ نہیں رحم آ رہا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ انشاء اللہ ایک روز ہم ان کی بیماری کو دور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہمیں توقع تھی کہ اس واقعہ کے بعد شہر کے مسلمان اکابر سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور سوچیں گے کہ اس صورت حال پر قابو کس طرح پایا جائے اور اس کی اصلاح کی کیا تدبیر کی جائے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ اگلے ہی روز بلوائیوں کی ان حرکات کو حق بجانب ٹھیرانے کے لیے دلائل وضع کیے جانے لگے۔ کسی نے کہا کہ ناظم اجتماع سے بعض لوگوں کی ذاتی عداوت کی بنا پر یہ سب کچھ ہوا، کسی نے کہا کہ مسلم لیگ کے لوگوں کو اجتماع کے انتظام میں شریک نہ کرنے کی وجہ سے یہ ہوا، کسی نے فرمایا کہ جماعت کے کسی کارکن سے جب پوچھا گیا کہ یہ اجتماع کس لیے منعقد کیا جا رہا ہے تو اس نے جواب دیا کہ لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے، اس سے عوام میں اشتعال پھیل گیا وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر ان دلائل کی تصنیف و ایجاد یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ چند روز بعد مدراس پراونشل مسلم لیگ کے صدر جناب محمد اسمٰعیل صاحب ایم۔ ایل۔ اے نے بہت سے اخبارات میں ایک طویل بیان شائع کر دیا جس میں انھوں نے بلوائیوں کے اس طرز عمل کو اس طرح صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اجتماع میں جو تقریریں کی گئیں ان میں مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں پر نہایت ناز یبا حملے کیے گئے تھے..... (الخ بیان) اس قسم کے جلسوں کے خلاف سخت اقدام کرنا ہی چاہیے (تھا)۔ اسی سلسلہ میں مدراس کے ایک اور متعصب مسلم لیگی کا حسب ذیل خط

امیر جماعت کے نام موصول ہوا :-

بھائی جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مدظلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ بعض حضرات سے یہ بات سننے میں آئی ہے کہ آپ مدراس سے رنجیدہ ہوکر تشریف لے گئے ہیں اور آپ نے یہاں کی پبلک کو بدتہذیب وغیرہ کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پبلک نے آپ کے جلسے میں ہنگامہ برپا کیا لیکن یہ عوام کی غلطی نہیں تھی بلکہ خود آپ کے بعض کارکنوں کا غلط رویہ تھا۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ باشندگان مدراس مسٹر جناح پر بھروسہ رکھتے اور ان کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسری جماعتوں کے خیالات و معتقدات سننے سے انکار کردیں۔

اصل بات یہ ہے کہ مدراس میں جو کچھ ہوا اس کی پوری ذمہ داری صرف .... پر عائد ہوتی ہے۔ یہ صاحب مدراس میں کانگرسی مشہور ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ مسٹر جناح کو برا بھلا کہتے ہیں اور مسلم لیگ پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ پبلک ان سے پہلے ہی ناراض تھی اس لیے اب جو جلسہ ہوا اور ناظم اجتماع یہ صاحب مقرر ہوئے تو پبلک کو یقین ہوگیا کہ یہ جلسہ مسلم لیگ کے خلاف ہے۔ لیکن بعد میں اصل حقیقت معلوم ہوئی کہ آپ کی جماعت کو کانگریس یا جمعیۃ العلماء سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم مودبانہ عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کا کام عمدگی کے ساتھ مدراس میں ہوسکے تو دو ہستیوں کو یہاں سے ہٹا دینا ضروری ہے، ایک .... اور دوسرے .... جب تک دونوں صاحب یہاں رہیں گے آپ یقین فرمایئے کہ جماعت اسلامی کی قطعاً ترقی نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ دونوں یہاں کی پبلک کی نظروں میں بدرجہ ساقط الاعتبار ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ ہماری ان غلطیوں کو معاف کردیں گے جن کے باعث آپ کو تکلیف محسوس ہوئی۔ جواب سے سرفراز فرمائیں تو بڑی نوازش ہوگی۔

فقط والسلام
دستخط
۲۹ اپریل ۱۹۴۷ء

اس خط کا جواب امیر جماعت نے حسب ذیل دیا:-

محترمی و مکرمی - السلام علیکم و رحمۃ اللہ - آپ کا عنایت نامہ مجھے کل ہی ملا - اس میں شک نہیں کہ میں مدراس سے رنجیدہ آیا ہوں لیکن یہ گمان نہ کیجیے کہ میرا یہ رنج کچھ اپنی ذات کے لیے ہے یا اپنے بگڑے ہوئے مسلمان بھائیوں پر مجھے کوئی غصہ ہے۔ بلکہ رنج اس بات کا ہے کہ مدراس میں میں نے مسلمان عوام کو جس حالت میں پایا وہ بہت افسوسناک ہے اور اس سے مجھے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچے گا۔ میں مدراس کے عمائد اور شرفا سے زبانی بھی کہہ چکا ہوں کہ عوام کا اس قدر خود سر اور بے لگام ہو جانا کوئی اچھی حالت نہیں ہے اور اس سے اندیشہ ہے کہ وہ کسی وقت اپنے لیڈروں کے نقشے کے بالکل خلاف کوئی جنگ چھیڑ دیں گے اور اس سے پورے جنوبی ہند کے مسلمانوں کی زندگی پر نہایت برا اثر پڑے گا۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مدراس میں عوام نے جو کچھ کیا وہ نہ تو مسلم لیگ کے لیڈروں کے اشارے سے تھا اور نہ لیڈر اس پر راضی ہی تھے۔ اب ان کی حرکات کی اس کے سوا کیا توجیہ کی جائے کہ وہ اپنے لیڈروں کے قابو سے باہر ہو چکے ہیں، اب لیڈر آپ بن گئے ہیں اور کسی مفسد اور شورہ پشت اور غیر ذمہ دار آدمی کے بھڑکانے سے بآسانی ایک شورش برپا کر سکتے ہیں۔ آج یہ چیز ہمارے خلاف ہوئی اس لیے اس کا کوئی برا اثر نہیں ہوا کیونکہ ہم بہرحال ان کے خیر خواہ ہیں اور وہ ہمارے ساتھ برائی بھی کریں تو ہم ان کے ساتھ برائی کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ لیکن کل اگر انھوں نے کسی ایسی پارٹی کے خلاف اس قسم کی کوئی حرکت کی جو انھی کی طرح شورہ پشت ہو اور جس کی پشت پر حکومت کی اکثریت بھی ہو تو یہ چیز نہایت خطرناک فسادات کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ یہ باتیں ہیں جن کو میں چاہتا ہوں کہ مدراس کے شرفاء اور عمائد اچھی طرح سمجھیں اور ان کی اصلاح کی فکر کریں۔

.... اور .... صاحبان کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگر سو فیصدی صحیح ہو تب بھی کیا مدراس کے عوام کے لیے یہ جائز ہو سکتا تھا کہ وہ شراب پیے ہوئے بدمعاشوں کو لے کر ہمارے مقام اجتماع میں گھسیں، جوتے اچھالیں، کھانا لوٹ کر لے جائیں، اجتماع گاہ کی دوسری چیزیں چرائیں اور در

ایک دینی جماعت کے پنڈال میں زبردستی تصویریں لاکر لٹکائیں۔ میں حیران ہوں کہ آخر آپ لوگ ...... صاحب یا کسی اور شخص پر ذمہ داری ڈال کر عوام کی ان ناجائز اور بیہودہ حرکات کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ بالفرض اگر یہ کانگریسی مسلمانوں کا اجلاس ہوتا تب بھی کیا یہ کمینہ حرکات جائز ہو سکتی تھیں؟

میں نے مدراس کی جماعت کے ارکان سے برسر موقع کافی باز پرس کی تھی، ان تمام الزامات کی تحقیق کی تھی جو مجھ تک پہنچے تھے اور ان کو محتاط رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ لیکن یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ جو لوگ ہماری اس دعوت پر لبیک نہیں کہتے ان کی خاطر میں ان چند لوگوں کو اپنے سے دور پھینک دوں جو مدراس کے لاکھوں مسلمانوں میں سے اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے آگے بڑھے ہیں۔ مدراس کے بہتر آدمی اس کام کے لیے پیشقدمی کریں تو ان شاء اللہ وہ آپ سے آپ جماعت میں آگے ہو جائیں گے اور جو لوگ قابلیت اور اخلاق میں ان سے کم تر ہوں گے وہ پیچھے چلے جائیں گے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ، ۷ر مئی ۴۷ء

ہم نے یہ سارا واقعہ بلاکم وکاست ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس سے وہ تمام غلط فہمیاں جو بے بنیاد پروپگنڈے اور غلط بیانات کی اشاعت سے جنوبی ہند کے بعض حلقوں میں پھیلائی جا رہی ہیں، دور ہو جائیں گی۔

اجلاس سوم بروز ہفتہ ۲۶ر اپریل ۴۷ء — یہ اجلاس خاص تھا اور امیر جماعت کی قیامگاہ پر منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں صرف ارکان اور ہمدرد ہی شریک ہوئے اور اس میں حسب ذیل کارروائی ہوئی:

(۱) صوبہ مدراس کی رپورٹ کا بقیہ حصہ قیم صوبہ نے پیش کیا۔

(۲) مولوی محمد یونس صاحب قیم حلقہ ریاست حیدرآباد (دکن) نے اپنے حلقہ کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔

(۳) سید عبدالحکیم صاحب قیم حلقہ ریاست میسور نے اپنے حلقہ کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔

اس کے بعد جنوبی ہند کے ارکان اور جماعتوں کی طرف سے جو تجاویز اور مشورے آئے ہوئے تھے وہ پیش ہوئے۔ پہلے قیم جماعت تجویز یا مشورے پڑھ کر سنا دیتے تھے۔ اس کے بعد مجوز صاحب اور دوسرے لوگوں کو موقع دیا جاتا تھا کہ وہ اس کے موافق یا مخالف کچھ کہنا چاہیں کہیں، اور آخر میں امیر جماعت اپنے فیصلے یا رائے کو بیان کرکے پھر حاضرین کو موقع دیتے تھے کہ اگر ان کو ان کے فیصلے یا اظہار رائے سے اطمینان نہ ہوا ہو تو اپنے شبہہ کو پیش کریں۔ لیکن اس کا موقع نہیں آیا۔ تجاویز اور ان پر فیصلے نمبروار درج ذیل ہیں:۔

تجویز نمبر ۱۔ ریاست حیدرآباد میں چونکہ تعلیم بہت کم ہے اس لیے ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو صرف معمولی اردو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کو اسلام کی دعوت سے واقف کرانے اور اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خطبات کو الگ الگ پمفلٹوں کی شکل میں شائع کیا جائے ان کی قیمت اور صفحات کم ہونے کی وجہ سے عوام انھیں بآسانی خرید اور پڑھ لیتے ہیں اور اس سے آئندہ کے لیے راستہ کھل سکتا ہے۔

اس تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے مولوی محمد یونس صاحب نے مقامی حالات کی کچھ مزید تفصیلات بتائیں اور اس پر امیر جماعت نے حسب ذیل دو سوالات ان سے دریافت کیے:

(۱) کیا اس سے یہ بدگمانی تو پیدا نہ ہوگی کہ یہ پیسے بٹورنے کی مختلف صورتیں ہیں کہ ایک ہی چیز کو الگ الگ پمفلٹوں کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے اور پھر اسی کو کتابی شکل میں شائع کرکے دوبارہ قیمت وصول کی جاتی ہے؟

(۲) ہماری کتابوں کے سارے مضامین مل کر ایک چیز پیش کرتے ہیں۔ ان کو الگ الگ کرکے پیش کرنے کی مثال ایسی ہوگی جیسے کسی آدمی کے مختلف اعضاء کو الگ الگ کرکے دکھایا جائے۔ اس سے پڑھنے والے کے سامنے پوری بات نہیں آئے گی اور نہ وہ ہمارا مقصد سمجھ سکے گا۔ آپ اس قباحت کو کس طرح دور کریں گے؟

ان سوالات کے جواب میں مولوی محمد یونس صاحب نے کہا کہ ریاست حیدرآباد میں اس امر

کوئی اندیشہ نہیں کہ عوام تک دعوت پہنچانے کی ہماری اس تدبیر کو کتب فروشی پر محمول کیا جائے گا بلکہ لوگ تو اس کے لیے خود اصرار کر رہے ہیں اور مرکز کی ہدایات کے ماتحت خطبات کی الگ اشاعت روک دینے سے حیدرآباد میں تبلیغی کام کو بہت نقصان پہنچا ہے۔

دوسرے سوال کے جواب میں: یونس صاحب نے کہا کہ اگر ایک ایک خطبہ الگ الگ شائع کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ ہماری کوئی پوری بات پڑھنے والے کے سامنے نہیں آئے گی تو خطبات کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے شائع کر دیا جائے۔ مثلاً حقیقت اسلام، حقیقت نماز، حقیقت زکوٰۃ..... ..... حقیقت حج اور حقیقت جہاد۔ اس طرح ہر بات پوری آجائے گی۔

امیر جماعت: اگر یہ بات ہے تو ریاست حیدرآباد کے مخصوص حالات کے لحاظ سے وہاں کے لیے اس کی اجازت ہے لیکن اسے صرف آپ کے کارکن اپنی تبلیغ میں استعمال کریں۔ اس کا کوئی اشتہار نہ دیا جائے اور نہ اسے عام مکتبوں میں رکھا جائے اور اگر بعد میں کوئی بدگمانی پیدا ہوتی دیکھیں تو یہ اشاعت بند کر دی جائے۔

مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب: مدراس کے حالات بھی بالکل وہی ہیں جو حیدرآباد کے بیان کیے گئے ہیں اور یہاں بھی خطبات کے پمفلٹوں کی شدید ضرورت ہے۔

امیر جماعت: آپ اپنی ضروریات کے مطابق حیدرآباد سے منگوا لیا کریں لیکن یہاں بھی ان کا اشتہار نہ دیں اور نہ عام طور پر مکتبوں میں انہیں فروخت کیا جائے۔

تجویز نمبر ۲۔ ہندوستان کی اکثریت غیر مسلم ہے اور ہمارا لٹریچر صرف مسلمانوں کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے اس لیے غیر مسلم طبقہ میں دعوت پھیلانے کے لیے ضروری ہے کہ غیر مسلموں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر مرکز سے آسان لٹریچر تیار کیا جائے جس کا ترجمہ غیر مسلموں کی زبانوں میں بھی کیا جائے۔

امیر جماعت۔ اس سوال کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ موجودہ مضامین ہی کو آسان اور سلیس زبان میں منتقل کیا جائے اور دوسرے یہ کہ غیر مسلموں کی نفسیات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر الگ مضامین لکھے جائیں۔ آپ کی مراد کس کام سے ہے؟

مولوی محمد یونس صاحب (مجوز)۔ میری مراد پہلی شکل سے ہے۔

امیر جماعت ۔ ہم نے گذشتہ سال الہ آباد کے اجتماع میں عوامی لٹریچر کے لیے ایک حلقہ بنایا تھا لیکن اس حلقے نے اب تک کوئی کام نہیں کیا۔ ارکان اور ہمدردوں کو خود اس سلسلے میں قدم اٹھانا چاہیے۔ میرے لیے اب مشکل ہے کہ میں کوئی نیا کام شروع کروں۔ میں تو دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اتنی ہی طاقت دیدے کہ تفہیم القرآن کو مکمل کر لوں اور ایک دو مزید کام جو میرے پیش نظر ہیں انھیں انجام دے سکوں۔ میں کام کے لیے ہدایات دے سکتا ہوں، اور اس کی نگرانی بھی کر سکتا ہوں مگر خود کچھ زیادہ کام کرنا اب میرے لیے مشکل ہے۔ جہاں تک زبان اور انداز بیان کے سہل کرنے اور عام فہم طریقوں سے بات کو سمجھانے کا تعلق ہے اس کی فی الواقع ضرورت ہے، مگر غیر مسلموں کے لیے الگ لٹریچر تیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ غیر مسلموں کا کوئی ایک گروہ نہیں ہے بلکہ بے شمار گروہ ہیں۔ ان سب کو الگ الگ مخاطب کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کی کوئی واقعی ضرورت ہے۔ ہر دعوت اپنے براہ راست مخاطب لوگوں کو ہی سامنے رکھ کر خطاب کیا کرتی ہے اور اسی سے سب لوگ یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ کیا ہے اور کیا چاہتی ہے۔ قرآن نے بھی یہی طرز اختیار کیا ہے۔ اگرچہ اس کے پیش نظر پوری دنیا کی اصلاح ہے لیکن اس نے صرف عربوں کو مخاطب کیا جو اس کے مخاطب اول تھے، انہی کی گمراہیوں پر اس نے تنقید کی۔ انہی کی خرابیوں کو نمایاں کیا اور انہی کی نفسیات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنی دعوت کو پیش کیا۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اسی قرآن سے دنیا کے بیشتر حصے میں اسلام پھیل گیا۔ ہر وہ شخص جو قرآن کو پڑھے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اسلام کیا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی دوسری تحریکیں بھی اپنے مخاطب ملک کے لوگوں کے حالات ہی کو سامنے رکھ کر پیش کی جاتی ہیں اور انھیں سے ساری ہی دنیا ان کو سمجھتی ہے۔ یورپین تہذیب و فلسفہ ہی کو لے لیجیے۔ وہ سارے کا سارا یورپ کے لوگوں کے مسائل ہی کو حل کرتا ہے اور انھیں کے حالات سے بحث کرتا ہے لیکن اسی سے پوری دنیا متاثر ہو رہی ہے اور اثر لے رہی ہے۔ اس لیے دعوت اسلامی کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنے

کے لیے بھی کسی الگ لٹریچر کی ضرورت نہیں بلکہ جو لٹریچر مسلمانوں کے لیے لکھا گیا ہے وہی غیرمسلموں کو اسلام سمجھانے کے لیے کافی ہوگا۔ اصل ضرورت ایک منظم اور متحرک جماعت کی ہے جو اس دعوت کو لے کر اٹھے اور اپنی عملی زندگی میں دکھا دے کہ اسلام یہ ہے۔

تجویز نمبر ۳۔ تیسری تجویز وہی تھی جو ٹونک کے اجتماع میں پیش ہونے والی تجاویز میں نمبر ۱ پر درج ہے اس لیے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

تجویز نمبر ۴۔ قرآن کی وہ آیات خطبوں کی شکل میں مرتب کی جائیں جن سے ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت پیدا اور مستحکم ہوتا ہے، تاکہ جو ارکان اور دوسرے لوگ قرآن مجید کا گہرا علم نہیں رکھتے اور خود ان آیات کو قرآن سے تلاش اور مرتب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ ان خطبات کی مدد سے اسلام کی بنیادی دعوت کو قرآن ہی سے سمجھ سکیں اور ان کو قرآن کا طریق دعوت بھی معلوم ہو۔

امیر جماعت۔ یہ تجویز نوٹ کر لی جائے اور حلقہ قرآنی مضامین والوں کو دے دی جائے کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔ باقی رہا قرآن کا طریق دعوت تو اس پر مولانا امین احسن صاحب مفصل کتاب لکھ رہے ہیں اور وہ عنقریب شائع ہو جائے گی۔[1]

تجویز نمبر ۵۔ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی وہ زبانیں ہیں جو مسلمان ممالک اور اقوام میں بالعموم بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں لٹریچر کے تراجم اور اشاعت کی رفتار کو جس قدر زیادہ تیز کیا جائے گا اسی قدر جلدی دوسرے مسلمان ممالک میں سے صحیح الفکر اور سلیم الطبع لوگ اس دعوت کی طرف متوجہ ہوں گے اور ان کے ذریعے یہ دعوت ان ممالک میں پھیلے گی۔ اس لیے اس طرف خاص طور پر توجہ کی جانی چاہیئے۔ نیز انگریزی زبان کو جو اہمیت اس وقت متمدن دنیا میں حاصل ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے انگریزی تراجم کی جلد سے جلد اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

امیر جماعت: ہم پہلے ہی اس کام کو اپنی وسعت و وسائل کی حد تک کر رہے ہیں اور ہمارے

---

[1] یہ کتاب مکمل ہو چکی ہے اور اس وقت زیر طبع ہے۔

کوشش ہے کہ اس کام کو زیادہ سے زیادہ تیز کیا جائے۔ لیکن نہ تو ہمارے پاس کارکن کافی تعداد میں موجود ہیں، نہ مترجم مل رہے ہیں اور نہ کاغذ ہی ضرورت کے مطابق مہیا ہو رہا ہے۔ فارسی میں اب تک ایک ہی صاحب کام کرنے کے لیے ملے ہیں اور وہ بھی گوناگوں مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ عربی کا کام بھی صحیح قسم کے کارکنوں کی کمی کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ ہو رہا ہے۔ انگریزی میں باوجود مسلسل کوشش کے ابھی تک ہمیں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو اس کام میں پورا وقت اور محنت صرف کرے اور اس کو خاطر خواہ کر بھی سکتا ہو۔ ورنہ ہم اس ضرورت سے نہ ناواقف ہیں اور نہ غافل۔

تجویز نمبر ۶۔ اجتماع الٰہ آباد میں ارکان کی صلاحیتوں کے لحاظ سے جو حلقہ بندی کی گئی تھی ان حلقوں کی کارگذاری کی اطلاع ارکان کو وقتاً فوقتاً ملتی رہنی چاہیے مثلاً ان کی سہ ماہی رپورٹیں ترجمان میں شائع کر دی جایا کریں۔

امیر جماعت۔ ابھی تک ان حلقوں میں کوئی تسلی بخش کام شروع نہیں ہوا۔ جب ان میں کچھ کام ہونے لگے گا تو پھر اس تجویز پر عمل کیا جا سکے گا۔

تجویز نمبر ۷۔ انگریزی تعلیم یافتہ اور غیر مسلموں میں تبلیغ کرنے کے لیے انگریزی زبان میں ایک پندرہ روزہ یا ہفتہ وار اخبار یا رسالہ جماعت کی طرف سے جاری کیا جائے۔

امیر جماعت۔ اس کی ضرورت ہم خود محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن مناسب آدمیوں کا فقدان مانع ہے۔ جو لوگ اس بارے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں وہ ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

تجویز نمبر ۸۔ پچھلے سال اجتماع الٰہ آباد میں ایک تجویز پیش کی گئی تھی کہ مختلف جماعتوں کے ماہانہ اجتماعات کی کارروائیاں شائع کرنے اور دوسرے جماعتی کاموں اور پروگراموں کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچانے کے لیے آسان اردو زبان میں ایک پندرہ روزہ یا ہفتہ وار اخبار یا رسالہ جماعت کی طرف سے جاری کیا جائے اور یہ تجویز منظور کی گئی تھی۔ معلوم نہیں کہ کن موانعات کی وجہ سے یہ تجویز اب تک عمل میں نہیں آسکی۔

امیر جماعت۔ جن چیزوں کی اشاعت ضروری اور مفید ہے وہ کوثر میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ہم پبلسٹی کا چسکا لگانا نہیں چاہتے۔ جس کی خاطر ہم کام کر رہے ہیں وہ سب کچھ جانتا ہے۔ ہم صرف وہی چیزیں شائع کرتے ہیں جن کی اشاعت دعوت و تبلیغ کے لیے ناگزیر ہو۔ یہ ضرورت کوثر پوری کر رہا ہے۔ لہٰذا محض اس غرض کے لیے تو کسی الگ اخبار کے اجراء کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر جماعت کی دعوت کو تیز تر کرنے کے لیے ضرورت محسوس ہوئی تو ایک ہفتہ وار پرچہ جاری کر دیا جائے گا۔

جنوبی ہند کی زبانوں میں اشاعت کا انتظام

تجاویز کے بعد جنوبی ہند کی بڑی زبانوں (تامل، تلنگی، مرہٹی، کنڑاہی اور ملیالم) میں دارالاشاعت قائم کرنے کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ امیر جماعت نے جنوبی ہند کے ارکان کو بتایا کہ اب حالات ایسے پیدا ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے جنوبی ہند میں اور ہندو اکثریت کے دوسرے علاقوں میں اردو زبان کی مدد سے دعوت کا کام کرنا مشکل تر ہوتا چلا جائے گا۔ غیر مسلموں میں تو اردو کے ذریعہ سے اس دعوت کا پھیلانا پہلے ہی مشکل تھا، مگر اب رفتہ رفتہ خود مسلمانوں میں بھی مشکل ہوگا، اس لیے کہ آئندہ ذریعہ تعلیم ہر علاقے کی اپنی زبان ہوگی اور وہی سرکاری زبان بھی قرار پائے گی۔ اردو کا چلن کم سے کم تر ہوتا چلا جائے گا۔ اگر اس حالت کے رونما ہونے سے پہلے پہلے ان مقامی زبانوں میں اسلامی لٹریچر خاصی تعداد میں مہیا نہ کر دیا گیا تو آئندہ خود مسلمان نسلوں کو بھی اسلام سے روشناس کرانے کا کوئی ذریعہ نہیں رہے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ان زبانوں میں اسلامی لٹریچر منتقل کرنے کا جلد سے جلد انتظام کریں۔

ملیالم دارالاشاعت تو ہم قائم کر چکے ہیں اور اس میں کچھ کام بھی شروع ہو گیا ہے لیکن جنوبی ہند کی باقی چار زبانوں میں ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہو سکا۔ اب اس اجتماع میں ہمیں ان کے متعلق سوچنا ہے۔

تامل تامل دارالاشاعت کے قیام کے لیے ہم عرصے سے کوشش کر رہے ہیں لیکن اب تک اس بارے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سلسلے کے سارے حالات کو سامنے رکھ کر بہت لمبی بحث و گفتگو ہوئی اور آخر کار امیر جماعت نے فرمایا کہ مولوی شیخ عبداللہ صاحب وقتاً تامل دارالاشاعت کے نگران

حیثیت سے کام کریں۔ جناب محی الدین عبدالقادر جیلانی صاحب کیا پٹنام ترجمے کا کام کریں۔ بعد میں جب عبدالصمد صاحب ندوی ندوہ سے فارغ ہو کر آجائیں تو ان سے بھی کام لیا جائے۔ اس کے علاوہ دو تین آدمیوں کی کمیٹی اس غرض کے لیے بنائی جائے جو دارالاشاعت کے مختلف کاموں میں ضروری امداد اور مشورے دے۔ آپ لوگوں (صوبہ مدراس کے ارکان) کو دو ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس دوران میں ایک طرف یہ معلوم کیا جائے کہ مقامی طور پر کس قدر وسائل و ذرائع فراہم کیے جا سکتے ہیں، اور دوسری طرف مولوی عبدالجبار شریف صاحب شہر مدراس یا اس کے مضافات میں ایک ایسے مکان کی تلاش کریں جو شامل دارالاشاعت کے کارکنوں اور قیم صوبہ مدراس کی سکونت اور دفاتر کے لیے کافی اور موزوں ہو۔ پھر ان دونوں کاموں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تاکہ مولوی شیخ عبداللہ صاحب اور دارالاشاعت کے دوسرے کارکن تنظیمی کاموں میں قیم حلقہ کا ہاتھ بٹائیں اور قیم حلقہ دارالاشاعت کے کام کی نگرانی و امداد کر سکیں۔

تلنگی و مرہٹی | ان دونوں زبانوں میں ترجمے کرانے اور دارالاشاعت قائم کرنے کے لیے حیدرآباد دکن کی جماعت نے اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ وہ اس کا سارا انتظام اپنے ذمے لینے کو تیار ہیں۔ حیدرآباد میں جماعت کا جو ادارہ دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ کے نام سے قائم ہے وہ اپنے سرمائے سے اس کام کو کرے گا۔ اور مترجمین کا انتظام بھی انشاءاللہ کر لیا جائے گا۔

اس دارالاشاعت کی سکیم مکمل کرنے کے لیے امیر جماعت نے حیدرآباد کی جماعت کو دو ماہ کی مہلت دی۔

کنڑی | اس کے متعلق احمد نوری صاحب منگلوری ہمدرد جماعت اور انچارج کنڑی دارالاشاعت نے بتایا کہ سرورِ عالم کا ترجمہ وہ شائع کر چکے ہیں، بنیادی عقیدہ اس وقت زیر طبع ہے، اور بھی کچھ پمفلٹ اشاعت کے لیے تیار ہیں۔ کارکن بھی کچھ موجود ہیں، لیکن مشکل کاغذ اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے پیش آ رہی ہے۔ اس بارے میں میسور کی جماعت نے امداد و تعاون کا وعدہ کیا اور امیر جماعت نے کچھ ضروری ہدایات دیں۔

اس پر اس اجلاس کا پروگرام ختم ہوا۔ بارہ بج چکے تھے اس لیے یہ اجلاس برخاست ہوا۔

اجلاس چہارم بروز ہفتہ ۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء یہ اجلاس خاص تھا اور امیر جماعت کی اختتامی تقریر اور ہدایات کے لیے مختص تھا۔ اجلاس حسب پروگرام امیر جماعت کی قیامگاہ پر ٹھیک ڈھائی بجے شروع ہوا اور اس اجلاس میں امیر جماعت نے حسب ذیل تقریر کی:

امیر جماعت کی اختتامی تقریر اور ہدایات الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم

رفیقو اور دوستو! اس وقت ہم ہندوستان کی تاریخ کے ایک بہت نازک اور فیصلہ کن مرحلے سے گذر رہے ہیں اور یہ مرحلہ جس طرح ہندوستان کے باشندوں کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہے اسی طرح ہماری اس تحریک کے لیے بھی فیصلہ کن ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس موقع پر ہم پوری ہوشمندی کے ساتھ اپنے اُس مقصد کو جس کے لیے ہم کام کرنا چاہتے ہیں، اور ان حالات کو جن میں ہمیں کام کرنا ہے، اور اس رخ کو جس کی طرف یہ حالات جا رہے ہیں، اور جس میں سے ہمیں اپنا راستہ نکالنا ہوگا، اچھی طرح سمجھ لیں، اور ہمارا ہر کارکن پوری بصیرت کے ساتھ یہ جان لے کہ موجودہ اور آئندہ حالات میں اسے کس حکمت عملی پر کاربند ہونا ہے۔

ہماری اس تحریک کا مقصد، جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، صاف اور واضح الفاظ میں یہ ہے کہ ہم اس صحیح طریق زندگی کو جس کا نام اسلام ہے انفرادی اور اجتماعی طور پر عملاً قائم کریں، اپنے قول و عمل سے اس کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ کریں، دنیا کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کریں کہ اسی طریق زندگی میں اس کے لیے فلاح اور سعادت ہے، اور موجودہ باطل نظاموں کی جگہ وہ نظام حق برپا کرنے کی جدوجہد کریں جو سراسر اس طریق زندگی پر مبنی ہو۔ اس مقصد کے لیے اگرچہ ہمیں کام تو ساری دنیا اور تمام نوع انسانی میں کرنا ہے، لیکن فطرۃً ہمارے کام کی جگہ وہی سرزمین ہے جہاں ہم پیدا ہوئے ہیں، جہاں کی زبان ہماری زبان ہے، جہاں کی رسم و رواج سے ہم واقف ہیں، جہاں کے نفسیات سے ہم آشنا ہیں اور جہاں کی معاشرت سے ہمارا پیدائشی رشتہ ہے۔ خود پیغمبر کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے اپنے وطن ہی کو جائے عمل اور مقام دعوت قرار دیا تھا، حالانکہ ان کا پیغام ساری دنیا کے لیے تھا

کسی پیغمبر کے لیے جائز نہ تھا کہ اپنے اس فطری حلقۂ کار کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے جب تک کہ اس کے اہل وطن اُسے نکال نہ دیں یا وہ خود دعوت و تبلیغ میں انتہائی کوشش صرف کرنے کے بعد ان سے مایوس نہ ہو جائے۔ لہٰذا ہماری اس جماعت کا فطری دائرۂ عمل بھی یہی سرزمین ہے جسے خدا نے ہماری سکونت کے لیے منتخب فرمایا ہے ــــ پوری جماعت کا دائرۂ عمل پورا ملک، ہر علاقے کے ارکان کا دائرہ ان کا اپنا علاقہ، اور ہر شہر قصبے یا گاؤں کے ارکان کا دائرہ ان کا اپنا وطن ــــ ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ پورے استقلال کے ساتھ اپنی جگہ جم کر دعوت اصلاح اور سعی انقلاب میں منہمک رہے اور اپنے مقام سے ہرگز نہ ہٹے جب تک کہ اس کا وہاں رہنا قطعی غیر ممکن نہ ہو جائے یا پھر وہاں دعوت حق کے بارآور ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہے۔ آنے والے حالات میں آپ بہت کچھ ہجرت و مہاجرت کی آوازیں سنیں گے اور بعید نہیں کہ عام رو کو دیکھ کر، یا خیالی اندیشوں سے سہم کر آپ میں سے بہتوں کے پاؤں اکھڑنے لگیں، لیکن آپ جس مشن کے حامل ہیں اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ میں سے جو شخص جہاں ہے وہیں ڈٹ جائے اور اپنی دعوت کو اپنے ہی علاقے کی زندگی پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔ آپ کا حال جہاز کے اس بہادر کپتان کا سا ہونا چاہیے جو آخر وقت تک اپنے جہاز کو بچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور ڈوبتے ہوئے جہاز کو چھوڑنے والوں میں سب سے آخری شخص وہی ہوتا ہے۔ آپ جس مقصد پر ایمان لائے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ جس علاقے میں آپ رہتے ہیں وہیں کے نظام زندگی کو بدلنے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ اس علاقے پر آپ کا اور آپ پر اس علاقے کا حق ہے، اور وہ حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس کی اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں انھیں دور کرنے میں آپ اپنا پورا زور صرف کریں اور جس ہدایت سے آپ سرفراز کیے گئے ہیں اس کا فائدہ سب سے پہلے اسے پہنچائیں۔

ہندوستان میں اس وقت جو حالات رونما ہیں وہ بظاہر ہماری دعوت کے لحاظ سے نہایت مایوس کن ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ سب لوگوں پر ان کا دل شکن اثر پڑ رہا ہے۔ ملک کی مختلف قومیں قومی خود غرضی میں بری طرح مبتلا ہیں اور قوم پرستی کا جنون بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا ہے

کہ ان سے وہ حرکات سرزد ہو رہی ہیں جنھیں اگر جانوروں سے بھی منسوب کیا جائے تو وہ اپنی توہین سمجھیں۔ قومی کشمکش نے جنگ کی اور جنگ نے وحشت و درندگی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ پہلے تو بات یہیں تک تھی کہ ہر قوم ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے دعوے اور جواب دعوے پیش کر رہی تھی اور اس پر تلخ کلامی کا سلسلہ چل رہا تھا، مگر اب نوبت یہ آگئی ہے کہ یہ مختلف قومیں ایک دوسرے کا نام و نشان تک مٹا دینے کے درپے ہیں۔ انھوں نے اپنی رہنمائی کا کام ایسے ایسے لیڈروں اور اخبار نویسوں کے سپرد کر دیا ہے جو انھیں ہر روز خود غرضانہ قوم پرستی کی شراب، نفرت و عداوت کا زہر ملا کر پلاتے ہیں اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی قومی خواہشات کی وکالت میں انصاف اور اخلاق کی ساری حدوں کو پھاندتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاقی تصورات کے لیے ان کے دلوں میں اب فی الواقع کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔ تمام اخلاقی معیارات قومیت کے تابع ہو گئے ہیں۔ جو کچھ قومی مفاد اور قومی خواہشات کے مطابق ہے وہی سب سے بڑا اخلاق ہے، خواہ وہ جھوٹ ہو، خیانت ہو، ظلم ہو، سنگدلی اور بے رحمی ہو، یا اور کوئی ایسی چیز ہو جو دنیا کے معروف اخلاقیات میں ہمیشہ سے بدی سمجھی جاتی رہی ہے۔ بخلاف اس کے سچائی، انصاف، دیانت، رحم، شرافت، انسانیت سب گناہ قرار پا چکے ہیں اگر وہ قومی مفاد کے خلاف پڑتے ہوں یا قومی خواہشات کے حصول میں مانع ہوں۔

ان حالات میں کسی ایسی دعوت کے لیے کام کرنا سخت مشکل ہے جو قومیتوں کو نظرانداز کر کے انسانیت کو خطاب کرتی ہو، جو قومی خواہشات کو چھوڑ کر خالص اصول حق کی طرف بلاتی ہو، اور قومی خود غرضیوں کو توڑ کر عالمگیر انصاف قائم کرنا چاہتی ہو۔ جنون قومیت کے اس دور میں ایسی دعوت کی آواز سننے کے لیے نہ ہندو تیار ہیں نہ مسلمان۔ مسلمان کہتے ہیں کہ تم ہماری قوم کے افراد ہو، تمہارا فرض تھا کہ قوم کے جھنڈے تلے کھڑے ہو کر قومی لڑائی لڑتے۔ یہ تم نے الگ جتھا بنا کر دین و اخلاق اور اصول حق کی رٹ کیا لگانی شروع کر دی۔ تمہاری اس صدائے بے ہنگام سے قوم کی طاقت منتشر ہوتی ہے اور قومی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا ہم تمھیں قوم کا دشمن سمجھتے ہیں خواہ تمہاری

دعوت اسی اسلام کی طرف ہو جس کا نام لے کر ہم یہ قومی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کے پاس جائیے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی بات دل کو تو مزور لگتی ہے مگر اس چھاچھ کو ذرا پھونک کے پینا چاہیے کیونکہ یہ ہیں تو اسی قوم کے افراد جس سے ہماری لڑائی ہے، کیا خبر کہ یہ اصلی دعوت بھی مسلمان قومیت ہی کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسری تدبیر ہو۔

لیکن یہ حالات خواہ کتنے ہی حوصلہ شکن اور صبر آزما ہوں، بہرحال مستقل نہیں ہیں بلکہ عنقریب بدل جانے والے ہیں۔ اس وقت آپ کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ صبر اور حسن اخلاق سے اپنا کام کیے جائیں، الجھنے والوں کے ساتھ نہ الجھیں، نادان لوگوں کی مخالفتوں پر برافروختہ نہ ہوں، جن لوگوں میں دوست اور دشمن تک کی تمیز باقی نہیں رہی ہے اور جو لوگ جوشِ جنوں میں اب خود اپنے بھلے اور برے تک کا ہوش نہیں رکھتے وہ اگر جہالت اور جاہلیت پر اتر آئیں تو آپ شریف آدمیوں کی طرح ان کے سامنے سے ہٹ جائیں اور ان کی زیادتیوں کو خاموشی سے سہ لیں۔ اس کے ساتھ آپ کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ معقول طریقہ سے اپنی دعوت مسلم اور غیر مسلم سوسائٹی کے ان سب لوگوں تک پہنچائیں جو معقول بات کو سننے اور اس پر کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس طریقہ پر اگر آپ نے عمل کیا تو ایک طرف آپ کی اخلاقی برتری کا سکہ بیٹھ جائے گا اور دوسری طرف وہ ذہنی فضا ایک حد تک تیار ہو جائیگی جو آنے والے حالات میں مؤثر کام کے لیے ضروری ہے۔

جس تغیر کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عنقریب ملک تقسیم ہو جائے گا، ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے علاقے اور مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقے الگ الگ مل جائیں گے۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں میں پوری طرح خود مختار ہوں گے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے اسٹیٹ کا نظام چلائیں گے۔ یہ بڑا تغیر اس نقشے کو بالکل بدل دے گا جس پر اس وقت تک حالات چلتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں، اور دوسری قوموں کے مسائل اور ان کی نوعیتیں بالکل بدل جائیں گی۔ ان کو بالکل ایک دوسری ہی صورت حال سے سابقہ پیش آئے گا جس ڈھنگ پر اس وقت تک انہوں نے اپنے قومی رویہ اور اپنی تحریکات اور جماعتی نظاموں کو قائم کر رکھا ہے وہ بڑی حد تک بے معنی اور

ناکارہ ہوجائے گا۔ بدلے ہوئے حالات میں ان سب کو سوچنا پڑے گا کہ جو کچھ اب تک وہ کرتے رہے ہیں اس نے انھیں کہاں لا کھڑا کیا ہے اور اب اس نئے دور زندگی میں ان کے لیے راہ عمل کیا ہے۔ آج کے بنے اور جمے ہوئے عقیدے اس وقت مہمل ہو جائیں گے۔ آج کے خیالات اور تصورات کے لیے اس وقت کوئی جگہ نہ ہوگی۔ آج کے نعرے اس وقت کھوٹے سکے ہوں گے جنھیں کوئی مفت کو بھی نہ پوچھے گا۔ جن بنیادوں پر آج کی قومی تحریکیں اور جماعتیں قائم ہیں وہ خود بخود ڈھے جائیں گی اس لیے صرف یہی نہیں کہ آج کی لیڈریاں اپنی طبعی موت مر جائیں گی بلکہ بعید نہیں کہ جو لوگ آج انھیں اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں کل وہی ان کو اپنے مصائب و آلام کا اصلی سبب سمجھنے لگیں۔

آنے والے اس دور میں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے حالات بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے، اور چونکہ ہمیں دونوں علاقوں میں کام کرنا ہوگا اس لیے ہمیں بھی اپنی تحریک کو دو مختلف طریقوں پر چلانا پڑے گا۔ بلکہ بعید نہیں کہ نظام جماعت کو بھی بڑی حد تک دو حصوں میں بانٹ دینا پڑے تاکہ ہر حصہ اپنے اپنے علاقے کے حالات کے مطابق مناسب پالیسی پر خود چل سکے اور اس کے لیے ضروری انتظامات خود کر سکے۔ جہاں تک مسلم علاقے کا تعلق ہے اس پر تو میں یہاں کوئی بحث نہ کروں گا، کیونکہ اس کے لیے موزوں مقام شمالی مغربی حلقہ کا اجتماع ہے جو عنقریب ہونے والا ہے۔ آپ کے سامنے مجھے صرف ہندو ہندوستان کے مستقبل پر گفتگو کرنی ہے کہ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کو آئندہ کن حالات سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور ان حالات میں آپ کو کس طرح کام کرنا ہوگا۔

سب سے پہلے مسلمانوں کے معاملہ کو لیجیے۔ ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کرلیں گے کہ جس قوم پرستی پر انھوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انھیں بیابانِ مرگ میں لا کر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ، جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے، ایک ایسے نتیجہ پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لیے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ جن جمہوری اصولوں پر ایک مدت سے ہندوستان کا سیاسی ارتقا ہو رہا تھا، اور جنھیں خود مسلمانوں نے

بھی قومی حیثیت سے تسلیم کر کے اپنے مطالبات کی فہرست مرتب کی تھی، انھیں دیکھ کر بیک نظر معلوم کیا جا سکتا تھا کہ ان اصولوں پر بنے ہوئے نظام حکومت میں جو کچھ ملتا ہے اکثریت کو ملتا ہے، اقلیت کو اگر ملتا بھی ہے تو خیرات کے طور پر دست نگر ہونے کی حیثیت سے، نہ کہ حق کے طور پر حریف اور مد مقابل اور شریک کی حیثیت سے۔ یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت تھی، مگر مسلمانوں نے اس کی طرف سے جانتے بوجھتے آنکھیں بند کیں اور اس دوہری حماقت کا ارتکاب کیا کہ ایک طرف تو نظام حکومت کے لیے مغرب کے انہی جمہوری اصولوں پر راضی ہو گئے اور دوسری طرف خود اپنی طرف سے تقسیم ملک کا یہ اصول پیش کیا کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں ہم حاکم اور تم محکوم ہو، اور جہاں تم اکثریت میں ہو وہاں تم حاکم اور ہم محکوم ہوں۔ کئی سال کی تلخ اور خونریز کشمکش کے بعد اب یہ مرکب حماقت "کامیابی" کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے، اور جس چیز کے لیے اقلیت کے مسلمان خود لڑ رہے تھے وہ حاصل ہوا چاہتی ہے، یعنی اکثریت کی آزاد و خود مختار حکومت جس میں وہ بحیثیت ایک قوم کے محکوم ہوں گے، اور محکوم بھی اس اکثریت کے جس سے وہ قومی جنگ لڑتے رہے ہیں۔

جو اسٹیٹ اب مسلم اقلیت کے علاقوں میں بن رہا ہے وہ ہندوؤں کا قومی اسٹیٹ ہوگا۔ قومیت و جمہوریت کے جن نظریات کو مسلمان اور ہندو یکساں تسلیم کر کے اپنی قومی تحریکوں کی اساس بنا چکے ہیں، ان کی بنیاد پر کوئی قومی اسٹیٹ اپنے اندر کسی دوسری ایسی قوم کے وجود کو گوارا نہیں کیا کرتا جو حکمراں قومیت سے الگ اپنی مستقل قومیت کی مدعی ہو اور پھر اس قومیت کے دعوے کے ساتھ اپنے مخصوص قومی مطالبات بھی رکھتی ہو۔ یہ چیز صرف اسی وقت تک چل سکتی تھی جب تک ملک عملاً ایک بیرونی قوم کا تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں اس کے محکوم تھے۔ صرف اسی وقت یہ ممکن تھا کہ اقلیت بھی اکثریت کی طرح اپنی الگ قومیت کا دعویٰ کرے اور کم و بیش اپنے کچھ مستقل حقوق منوا لے۔ مگر جب جمہوری اصول پر اہل ملک کی آزاد حکومت بن جائے گی تو ہندوستان اکثریت کا قومی اسٹیٹ بن کر رہے گا اور اس میں کسی اقلیت کی جداگانہ قومیت اور مخصوص قومی مطالبات کے لیے گنجائش نہ ہوگی۔ قومی اسٹیٹ ایسی کسی قومیت کو تسلیم کر کے اس کے مطالبے کبھی پورے نہیں کیا کرتا،

بلکہ وہ پہلے تو یہ کوشش کرتا ہے کہ اسے تحلیل کرکے اپنے اندر ہضم کرلے، پھر اگر وہ اتنی سخت نکلتی ہے کہ ہضم نہ ہوسکے تو اسے دبا دینا چاہتا ہے کہ جداگانہ قومی وجود اور اس کی بنا پر مستقل قومی مطالبوں کی آواز بلند ہونے ہی نہ پائے، اور بالآخر اگر وہ قومیت دباؤ کے نیچے بھی چھینے ہی چلی جائے تو پھر قومی اسٹیٹ اسے باقاعدہ فنا کرنے کی کوشش شروع کردیتا ہے۔ یہی کچھ ہندوؤں کے قومی اسٹیٹ میں مسلم اقلیت کو پیش آنے والا ہے۔ اس کے سامنے بھی عملاً یہی تین راستے پیش کیے جائیں گے۔

یا تو اپنی جداگانہ قومیت کے دعوے اور اس کی بنا پر مستقل حقوق کے مطالبے سے دست بردار ہوکر اسٹیٹ کی قومیت میں جذب ہوجائے،

یا اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہو تو ہر قسم کے حقوق سے محروم کرکے شودروں اور اچھوتوں کی سی حالت میں رکھی جائے،

یا اس پر استیصال کا پیہم عمل جاری کردیا جائے یہاں تک کہ قومی اسٹیٹ کے حدود میں اس کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

یہ لازمی نتیجہ ہے مغربی طرز کے ایک جمہوری نظام میں قومیت کی اساس پر اپنی سیاسی پالیسی کی عمارت اٹھانے کا۔ بصیرت کی آنکھیں اس نتیجہ کو اسی وقت دیکھ سکتی تھیں جب یہ پالیسی اختیار کی جارہی تھی اور نتیجہ ابھی بہت دور تھا۔ مگر اُس وقت دیکھنے سے انکار کیا گیا، اور دکھانے کی کوشش کرنیوالوں کو دشمن سمجھا گیا۔ اب یہ نتیجہ بالکل سامنے آگیا ہے اور افسوس کہ اسے دیکھنا ہی نہیں بھگتنا بھی پڑیگا۔

مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے جو گروہ اس وقت پیش پیش ہیں ان میں سے ایک "نیشنلسٹ" مسلمانوں کا گروہ ہے جو آنے والے دور میں وہی پارٹ ادا کرے گا جو انگریزی دور میں خان بہادر طبقہ ادا کرچکا ہے۔ یہ گروہ مسلمانوں کو دعوت دے گا کہ پہلی صورت کو برضا و رغبت قبول کرلیں، یعنی اپنی قومی انفرادیت کے دعوے اور مخصوص حقوق کے مطالبے سے دست بردار ہوکر سیدھی طرح اسٹیٹ کی قومیت میں ادغم ہوجائیں۔ اس گروہ کی بات اب تک تو نہیں چلی ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ آگے بہت کچھ چلنے لگے گی، کیونکہ آئندہ یہی لوگ سرکار رس ہوں گے، انہی کے توسط سے نوکریاں اور ٹھیکے

اور تعلیم گاہوں کے گرانٹ وغیرہ ملا کریں گے اور یہی حکمراں قوم اور محکوم قوم کے درمیان واسطہ و وسیلہ بنیں گے۔ ان کی کوششیں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد کو اس حد تک گرالانے میں کامیاب ہوجائیں گی کہ وہ خود جماعتیں اور ان کی بیویاں اور بیٹیاں شریمتیاں بنیں اور لباس، زبان، معاشرت، خیالات، ہر چیز میں حکمراں قوم سے اس درجہ ہمرنگ ہوجائیں کہ "تاکس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری" جس قوم کی ایک بڑی تعداد اس سے پہلے مسٹر اور مس بن چکی ہے آخر اس کے لیے اب یہ نیا تغیر ناممکن کیوں ہونے لگا، خصوصاً جب کہ آئندہ روٹی اور خوشحالی اور ترقی کا انحصار اسی پر ہوگا۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ مسلمان من حیث القوم اس طرح سپر ڈال دینے پر راضی ہوجائیں گے۔ قومی حیثیت سے ان کی کوشش یہی ہوگی کہ اس جذب و انجذاب کی مزاحمت کریں۔

مزاحمت کے لیے وہ ابتداءً اسی گروہ کی طرف رجوع کریں گے جو اس وقت سیاسی میدان میں ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ مگر تجربہ بہت جلدی مسلمانوں کو بتا دے گا کہ اب اس گروہ کی سیاست چلکر وہ سیدھے تباہی کے گڑھے کی طرف جائیں گے۔ اکثریت کے قومی جمہوری اسٹیٹ میں رہ کر اگر اقلیت قومی جنگ لڑے گی تو ہر طرف سے پیسی اور کچلی جائے گی، زندگی کے ہر شعبے سے نکالی جائے گی، ہر قسم کے حقوق سے محروم کی جائے گی، اچھوتوں سے بھی بدتر حالت میں گرادی جائے گی اور پھر بھی اگر اس کی آواز اٹھتی رہی تو اسے اس طرح مٹایا جائے گا کہ اس پر نہ زمین روئے گی نہ آسمان۔

کہا جاتا ہے کہ اقلیت کے مسلمانوں کو اس انجام سے بچانے کے تین ذریعہ ہیں:

ایک یہ کہ پاکستان کی ریاست ہندوستان کی ریاست سے سودا کرے گی، یعنی وہ کہے گی کہ پاکستان کی ہندو اقلیت سے ہم وہی سلوک کریں گے جو تم ہندوستان کی مسلمان اقلیت سے کرو گے اور اس طرح مسلمانوں کو وہی آئینی تحفظات مل جائیں گے جو ہندو پاکستان میں ہندوؤں کے لیے چاہیں گے۔ لیکن آغاز کار میں یہ تجویز خواہ کیسی ہی خوش آیند نظر آئے، مجھے یقین ہے اور تجربہ بتا دے گا کہ آگے چل کر یہ قطعاً ناکام ہوگی۔ ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں مغربی طرز سیاست کی راہ پر چلے جارہے ہیں۔ اس طرز سیاست کے جو نتائج مغرب میں نکل چکے ہیں وہی

یہاں نکل کر رہیں گے۔ اقلیت کی جداگانہ قومیت اور قومی حقوق اور مطالبوں کو مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ زیادہ مدت تک برداشت کر سکے گا اور نہ ہندوؤں کا قومی اسٹیٹ۔ خصوصاً جب یہ دونوں اقلیتیں اپنی اپنی ہم قوم بیرونی ریاست کی طرف استمداد کا ہاتھ پھیلائیں گی اور اپنے ملک کی حکومت کے بجائے بیرونی حکومت سے وفاداری، دلچسپی اور محبت کی پینگیں بڑھائیں گی تو ان کا وجود ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ ابتدا میں خواہ کیسے ہی اطمینان بخش آئینی تحفظات دونوں نے ایک دوسرے کی اقلیتوں کو دیے ہوں، رفتہ رفتہ عملاً ان کو ختم کر دیا جائے گا، روزمرہ کے برتاؤ میں اقلیتوں کا استیصال کرنے والی پالیسی چل پڑے گی، دونوں حکومتیں اپنی اپنی قومی اقلیتوں کی خاطر ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گی اور یا لآخر بات جنگ تک نوبت پہنچے گی ـــ جس کے نتیجے کے متعلق کوئی پیشینگوئی نہیں کی جا سکتی ـــ یا دونوں کو اس پر راضی ہونا پڑے گا کہ ایک حکومت ہندوؤں کے ساتھ اور دوسری حکومت مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ چاہے کرے۔

دوسرا ذریعہ تحفظ یہ بتایا جاتا ہے کہ اقوام متحدہ کے نظام (United Nations Organization) سے اس معاملہ میں مدد لی جائے گی۔ لیکن جو لوگ اس نظام کے مزاج کو کچھ بھی جانتے ہیں وہ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ذریعہ تحفظ کے بل پر کوئی دبی ہوئی قوم کتنے دن جی سکتی ہے۔ اول تو اقوام متحدہ کے نظام سے مرافعہ کسی ایسے ہی معاملہ میں کیا جا سکتا ہے جس میں کوئی بہت بڑی اور نمایاں ظالمانہ کارروائی کی گئی ہو۔ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات خواہ مجموعی طور پر مل کر کتنا ہی بڑا ظلم بن جائیں، بہرحال اس نظام میں قابل مرافعہ قرار نہیں پا سکتے۔ نہ اُن بظاہر معصوم پالیسیوں کو وہاں زیر بحث لایا جا سکتا ہے جو مغربی معیار کے لحاظ سے بالکل برحق ہوتی ہیں مگر ہمارے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی حیات دینی و ملی کو بالکل ختم کر دینے والی ہیں۔ پھر اس نظام نے اب تک تو یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ وہ بالکل بے لاگ انصاف کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ارکان صرف یہی نہیں دیکھتے کہ معاملہ بجائے خود کیسا ہے اور اس میں انصاف کا تقاضا کیا ہے، بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شکایت جس

حکومت کی کی گئی ہے اس سے ہماری اپنی حکومتوں کے تعلقات کیسے ہیں اور آیا اسے مطعون کرنا ہماری حکومتوں کی مصلحت کے مطابق ہے یا خلاف۔ اس بنا سے کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ زمانہ میں نظام اقوام متحدہ کے اندر ہندوستان اور پاکستان کی اضافی پوزیشن کیا ہوگی اور کس کی بات وہاں زیادہ وزن دار ہوگی

تیسرا ذریعہ ہجرت اور تبادلۂ آبادی کا بیان کیا جاتا ہے۔ ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان خود ہندوستان چھوڑ چھوڑ کر پاکستان میں جا بسنے شروع ہوں۔ اور تبادلۂ آبادی کا مطلب یہ ہے کہ دونوں حکومتیں باہمی قرارداد سے ایک نظم کے ساتھ اپنی اپنی ہم قوم آبادی کو اپنے علاقے میں منتقل کرلیں۔ ان میں سے پہلی صورت قابل عمل ہے مگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ حل نہ کر سکے گی، کیونکہ اس صورت میں وقتاً فوقتاً صرف کھاتے پیتے لوگ یا پست برداشتہ خاطر افراد و خاندان یا کچھ من چلے قسمت آزما لوگ ہی عمل کرسکیں گے، مسلمانوں کی عام آبادی جہاں اب بس رہی ہے وہیں بستی رہے گی اور اس کا کسی بڑے پیمانہ پر خود مہاجرت کرنا ممکن نہ ہوگا، الا یہ کہ کسی وقت خدانخواستہ وہ حالات پیش آجائیں جو بہار وغیرہ میں پیش آئے ہیں۔ رہی دوسری صورت، تو مجھے امید نہیں کہ آئندہ پچاس سال تک ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں اور ڈھائی تین کروڑ غیر مسلموں کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر منتقل کرنے کا انتظام کرسکیں گی، خواہ وہ دل سے ایسا کرنا چاہیں۔ تاہم اگر کوئی اس امید پر جینا چاہتا ہو تو ضرور جیے۔

یہ ہے ان ذرائع کی حقیقت جن کی بنا پر امید کی جارہی ہے کہ قوم پرستانہ سیاست جس طرح انگریزی اقتدار کے دور میں چلتی رہی ہے، اسی طرح ہندوستان کی قومی حکومت بن جانے کے بعد بھی چل سکے گی۔ آج مسلمان اپنی جہالت اور کم نگاہی کی وجہ سے ان حقائق کو نہیں سمجھ رہے ہیں، مگر وہ وقت قریب ہے جب یہ حقائق خود اپنے آپ کو ان کی سمجھ میں اتار دیں گے اور اس وقت لامحالہ ان کو تین راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا:

ایک یہ کہ نیشنلسٹ "مسلمانوں کی پالیسی قبول کرکے ہندو قومیت میں جذب ہونے پر تیار ہو جائیں"

دوسرے یہ کہ مسلم قوم پرستی کی موجودہ روش پر بدستور چلتے رہیں یہاں تک کہ مٹ جائیں ،

تیسرے یہ کہ قوم پرستی اور اس کے طور طریقوں اور اس کے دعووں اور مطالبوں سے توبہ کرکے اسلام کی رہنمائی قبول کرلیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنی قومی اغراض کے لیے سعی و جہد کرنے کے بجائے اپنی تمام کوششوں کو صرف اسلام کی اصولی دعوت پر مرکوز کریں اور من حیث القوم اپنے اخلاق ، اعمال اور اجتماعی زندگی میں اس کی شہادت دیں جس سے دنیا یقین کرسکے کہ فی الواقع یہ وہ قوم ہے جو اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ محض دنیا کی اصلاح کے لیے جینے والی ہے اور درحقیقت جن اصولوں کو یہ پیش کر رہی ہے وہ انسانی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی طور پر نہایت اعلیٰ و ارفع اور اصلح بنا دینے والے ہیں۔

یہی آخری راہ مسلمانوں کے لیے پہلے بھی راہ نجات تھی اور اب بھی اسی میں ان کے لیے نجات ہے۔ میں کئی سال سے ان کو اسی کی طرف بلا رہا ہوں۔ اگر یہ قوم پرستانہ سیاست کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اس راہ کو اختیار کرتے۔ اور جس طرح پچھلے دس سال میں انھوں نے اپنی پوری قومی طاقت کو اُس راہ پر لگایا ہے اُسی طرح کہیں اس راہ پر لگایا ہوتا تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا اور دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے۔ لیکن اُس وقت میری دعوت انھیں یمن کی دعوت یا ایک دیوانے دوست کی دعوت محسوس ہوئی۔ اب واقعات انھیں گھیر کر ناچار مسلمان کے مقام پر خود کھینچ لائے ہیں۔ اب ان کے لیے زندگی کی راہ صرف ایک ہی رہ گئی ہے اور وہ اسلام کی اصلی اور حقیقی اور مخلصانہ اسلام کی راہ ہے۔ دوسری راہیں زندگی کی نہیں بلکہ خودکشی یا سزائے موت یا طبعی وفات کی راہیں ہیں

یہ وقت جس کے آنے کی میں خبر دے رہا ہوں اب بالکل قریب آگیا ہے۔ جونہی کہ ہندوستان کی سیاست کا موجودہ دور ختم ہو کر نیا دور شروع ہوا، اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی واقعی یاس انگیز پوزیشن کا عام احساس شروع ہو جائے گا۔ یہ ایک بڑی تحریک کے انہدام کا

وقت ہوگا جو تحریک خلافت کے انہدام سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہوگا۔ تحریک خلافت کی ناکامی نے مسلمانوں پر جو جمود و انتشار طاری کیا تھا وہ اگرچہ نہایت نقصان دہ تھا مگر مہلک نہ تھا۔ اب اگر وہ کیفیت کہیں پھر طاری ہوئی تو قطعاً مہلک ثابت ہوگی۔ اپنے اس وقت تک کے رہنماؤں سے مایوس ہوکر کوئی صحیح رہنمائی اور کوئی شعاعِ امید اگر مسلمانوں نے نہ پائی تو ان پر گھبراہٹ اور طوائف الملوکی مسلط ہو جائے گی۔ کوئی نیشنلسٹ "مسلمانوں" کی طرف دوڑے گا، کوئی کمیونسٹ گروہ کی طرف لپکے گا، کوئی ہجرت کی تیاری کرے گا، کوئی مایوسی کی حالت میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے گا اور کوئی دل برداشتگی کے عالم میں، یا محض احمقانہ جھنجلاہٹ کی بنا پر، ہاری ہوئی قومی جنگ کو پھر تازہ کر کے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ اپنے ہزاروں لاکھوں بیگناہ بھائیوں پر بھی تباہی کا طوفان اٹھا لائے گا۔ اس نازک وقت کے لیے ابھی سے ایک ایسا منظم گروہ تیار رہنا چاہیے جو ہوش میں آنے والے مسلمانوں کے سامنے بروقت صحیح راہ عمل پیش کر سکے، ان کی مائل بانتشار قوتوں کو غلط کاریوں اور خام کاریوں سے بچا کر ایک روشن نصب العین کے گرد سمیٹ سکے، اور ان کو یاس کے بعد حقیقی کامیابیوں کی بشارت دے سکے۔ میری دعا ہے کہ آپ ہی کا یہ گروہ اس خدمت کے انجام دینے کی توفیق پائے اور اس وقت کے آنے سے پہلے اس حد تک طاقتور اور منظم اور مستعد ہو جائے کہ یہ خدمت انجام دے سکے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا ہند و ہندوستان کی اکثریت کے مستقبل کا بھی جائزہ لیں۔ میں آپ لوگوں سے اکثر کہتا رہا ہوں کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کا جتنا امکان مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہے قریب قریب اتنا ہی امکان غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی ہے۔ میری اس بات کو بہت سے لوگ ایک غرق تخیل آدمی کا خواب سمجھتے ہیں، اور بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غالباً یہ تصوف کا کوئی نکتہ ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لیے کہ ان کو صریح طور پر یہ نظر آتا ہے کہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک مضبوط، متحد، اور منظم بلاک بنی ہوئی ہے، اس کے اندر کہیں کوئی خلل یا شگاف نہیں ہے جہاں سے اس کے ٹوٹنے کا امکان ہو، اس پر قوم پرستی

کا نشہ پوری طرح مسلط ہے۔ ہندو انڈیا کا پورا نظام حکومت نہایت مستحکم طریقہ سے اس کے ہاتھ میں آچکا ہے اور جو تھوڑی سی کسر باقی ہے وہ عنقریب پوری ہوئی جاتی ہے۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہاں اسلامی انقلاب کا راستہ کدھر سے نکل آئے گا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مضبوط بلاک جو آپ کے سامنے نظر آرہا ہے، اور بظاہر ٹھوس بھی محسوس ہوتا ہے اس کی ساخت کو ذرا سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ یہ کن اجزا سے مرکب ہے اور ان کی پیوستگی کی نوعیت کیا ہے۔

ہندوستان کے ان کروڑوں غیر مسلموں کو جس چیز نے [illegible] اور منظم کیا ہے وہ کوئی مستقل نظریۂ حیات کوئی مضبوط فلسفۂ زندگی اور کوئی شعوری نصب العین نہیں ہے کہ اس کا متزلزل ہونا اور بدل جانا مشکل ہو، بلکہ وہ محض ایک قوم پرستی کا جذبہ ہے جو ایک طرف اجنبی اقتدار کے خلاف اور دوسری طرف مسلم قوم پرستی کے مقابلہ میں بھڑکایا گیا تھا۔ قوم پرستی کا فطری خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف کسی مخالف و مزاحم اور مبارز طاقت ہی کے مقابلہ میں پیدا ہوا کرتا ہے، اس کی شدت مزاحمت ہی سے بھڑکتا ہے، اور جب تک وہ طاقت مقابلہ میں موجود ہو اسی وقت تک باقی رہتا ہے۔ جونہی کہ مزاحمت ختم ہوئی اور قوم پرستی کا مقصد حاصل ہوا، یہ جذبہ آپ سے آپ دب جاتا ہے، اندرونی زندگی کے دوسرے اہم تر مسائل لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور وہ عناصر جو محض قوم پرستی کے جذبہ سے باہم پیوستہ ہوئے تھے، بکھرنے لگتے ہیں۔ ہندو قوم پرستی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ جن دو پاؤں پر کھڑی ہوئی تھی ان میں سے ایک ـــــ یعنی انگریزی اقتدار سے نجات پانے کا جذبہ ـــــ عنقریب گرا چاہتا ہے۔ اس کے بعد صرف دوسرا پاؤں باقی رہ جاتا ہے، یعنی مسلم قوم پرستی کے مقابلہ کا جذبہ۔ سو پاکستان کے بن جانے کے بعد اس کا قائم رہنا بھی مشکل ہے، بشرطیکہ ہندو علاقے کی مسلمان اقلیت اپنے مسئلے کو حل کرنے کی کوئی ایسی راہ نکال لے جس سے نہ تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی و نزاع کے اسباب پیدا ہوں اور نہ ہندوستان کے اندر مسلم قوم پرستی کے دعووں اور مطالبوں کو دبانے کے لیے ہندو قوم پرستی کے مشتعل ہونے کا

کوئی موقع باقی رہے۔ یہ حکمت اگر خدا نے مسلمانوں کو عطا کردی تو آپ دیکھیں گے کہ نیشنلسٹ لیڈر اور قومی و مذہبی عصبیتوں کے مبلغین مصنوعی خطرے اور جعلی ہوّے پیش کر کر کے موجودہ قوم پرستی کو زندہ اور مشتعل رکھنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں، وہ بہر حال مر کے رہے گی اور وہ مختلف و متضاد عناصر جن کی ترکیب سے یہ قوم پرست بلاک بنا ہے، بکھر کر رہیں گے۔ اس لیے کہ اس بلاک کے اندر خود اس کے اپنے عناصر ترکیبی کے درمیان جو تمدنی و معاشی بے انصافیاں، جو معاشی جفاکاریاں، جو اغراض و مفاد کی کشکشیں، اور جو طبقاتی منافرتیں موجود ہیں، وہ بیرونی خطرات کے ہٹتے ہی اپنے آپ کو بزور محسوس کرائیں گی اور ملک کے آئندہ انتظام، اختیارات کی تقسیم، حقوق کے تعین اور سماجی نظام کی تشکیل کے مسائل لامحالہ ان کو آپس میں پھاڑ دیں گے۔ اس تفرقہ کے لیے ایسے قوی اور فطری اسباب موجود ہیں کہ اسے رونما ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

ہندوستان کا موجودہ سماجی نظام کچھ اس طرز پر بنا ہے کہ وہ بے شمار طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے بعض بعض پر چڑھے ہوئے اور بعض ان سے دبے ہوئے ہیں۔ ان طبقوں کے درمیان پیدائشی برتری و پستی اور اٹل امتیازات کا تصور گہری جڑوں کے ساتھ جما ہوا ہے اور اس کو تناسخ کے فلسفے نے اور زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے۔ پست طبقوں کے حق میں یہ یقین پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پستی ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور یہ ان کے پچھلے کرموں کا لازمی نتیجہ ہے۔ جسے انھیں بہر حال بھگتنا ہی پڑے گا، جسے بدلنے کی ہر کوشش بے سود ہے۔ اور اونچے طبقوں کے حق میں یہ اذعان پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پیدا ہی برتری کے لیے ہوئے ہیں، برتری ان کا حق اور ان کے پچھلے کرموں کا نتیجہ ہے اور اس کو بدلنے کی کوشش قانون قدرت کے خلاف ہے۔ اس سماجی نظام میں ہر اوپر کا طبقہ نیچے والے طبقہ کے سر پر پاؤں رکھے کھڑا ہے اور اسے روند رہا ہے۔ معاشرت کے ہر پہلو میں اونچ اور نیچ کا امتیاز ہے۔ قدم قدم پر بے شمار بے انصافیاں ہیں۔ تمدن کے ہر گوشے میں امتیاز کا برتاؤ ہے خواہ کھانے پینے کا معاملہ ہو یا رہن سہن کا، یا شادی بیاہ کا، اور اس امتیاز میں صرف تفریق ہی کا نہیں بلکہ تحقیر اور تذلیل کا عنصر بھی شامل ہے۔ حد یہ ہے کہ اونچے طبقے

بنا دیتے ہیں۔ انہی طریقوں سے جن ہاتھوں میں دولت سمٹی ہے وہ اب جدید سرمایہ داری کے ڈھنگ اختیار کر کے ملک کی صنعت، تجارت اور مالیات پر مسلط ہوئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔

اب جو سیاسی نظام بنایا جا رہا ہے اس کی تصنیف میں کاغذ پر تو بلا شبہ جمہوریت، اجتماعی انصاف (Social justice)، مساوات اور مواقع کی یکسانی (Equal opportunities) کے بڑے بڑے نفیس تصورات بہت ستھری اور دلکش زبان میں رقم کیے جا رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان الفاظ کی اصل قیمت ان کے تلفظ میں نہیں، ان پر واقعی عملدرآمد میں ہے۔ عملاً جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس سیاسی نظام کی تشکیل، تعمیر اور تنفیذ کے سارے کام پر وہی طبقے حاوی ہیں جو سماجی اور معاشی نظام کی اوپر والی سیڑھیوں پر تشریف فرما ہیں ــــ نہیں، بلکہ پیدا ہوئے ہیں۔ اور تجربے نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ان طبقوں کو خدا نے سب کچھ دیا ہے مگر بڑا دل، وسیع نظر اور فراخ حوصلہ نہیں دیا۔ ان کی تنگ دلی اب تک بھی ہندوستان کو بہت کچھ نقصان پہنچا چکی ہے اور آئندہ بھی اسے دیکھتے ہوئے مشکل سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ اپنی سیاسی طاقت کو واقعی انصاف قائم کرنے میں استعمال کریں گے۔

یہ حالات اپنے اندر اتنی تلخیاں رکھتے ہیں جنھیں ملک کی عام آبادی شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ اب تک قوم پرستی کے نشے نے اس احساس کو بڑی حد تک دبائے رکھا تھا، اور لوگ اس امید پر جی رہے تھے کہ ملک کا انتظام جب ہمارے اپنے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ بے انصافیاں ختم ہو جائیں گی۔ اب انتظام کے اختیارات جب فی الواقع اہل ملک کی طرف منتقل ہو جائیں گے تو یہ سوال زیادہ دیر تک نہ ٹل سکے گا کہ ان اختیارات کو آئندہ کس طرح استعمال کیا جائے جس سے ملک میں حقیقی انصاف قائم ہو۔ ہندوستان کے مستقبل کی باگیں اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں آرہی ہیں وہ ہندو کلچر کی سابق روایات کے ساتھ مغربی یورپ اور امریکہ کے طریق زندگی کا جوڑ لگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ میرا اندازہ اگر صحیح ہے تو اس طرح سے وہ ایک نمائشی جمہوریت، ایک ظاہری مساوات اور ایک نظر فریب عدل قائم کرنے میں تو ضرور کامیاب ہو جائیں گے، مگر اس کی تہ میں

بدستور وہی بے انصافیاں، وہی ناہمواریاں اور وہی تفریقیں برقرار رہیں گی جو اس وقت پائی جاتی ہیں، کیونکہ تفریق و امتیاز ہندو کلچر کی رگ رگ میں پیوست ہے جس کے ہوتے کسی حقیقی جمہوریت کا قیام غیر ممکن ہے، اور اس کے ساتھ مغربی نظریات کا جوڑ لگنے سے اس کے سوا کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں کی جاسکتی کہ اونچے طبقوں کی برتری وسرمایہ داری کو الکشنوں اور ووٹوں کے ذریعہ سے سند جواز مل جائے۔ اسی لیے یہ امر قریب یقینی نظر آتا ہے کہ یہ لوگ بہت جلد ہی ہندستان کی عام آبادی کو مایوس کردیں گے۔ ان کے ہاتھوں انصاف قائم نہ ہوسکے گا، اور کچھ زیادہ دیر نہ گذرنے پائے گی کہ ہندوستانی عوام، کسان، مزدور، اور خود اونچے طبقہ کے محروم لوگ کسی دوسرے منصفانہ نظام کی طلب میں بے چین ہونے لگیں گے۔

اشتراکی گروہ اسی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی تیاریاں کررہا ہے۔ جونہی کہ موجودہ قوم پرستی اپنے مدعا کو پہنچنے کے بعد مضمحل ہوئی، وہ اسی طبقاتی خلل اور اسی تصادم اغراض کے شگافوں میں سے اپنا راستہ نکالنے کی کوشش کرے گا اور عام باشندوں کو انصاف کی امیدیں دلاکر سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہے گا۔ مگر اس گروہ کے پاس ان بے انصافیوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی ایسا پروگرام نہیں ہے جو خود ظلم سے، بے انصافی سے، کشت وخون اور فساد سے اور بالآخر جباری و قہاری سے پاک ہو۔ وہ ہندوستان کو موجودہ فرقہ وارانہ منافرت اور نزاع کی جگہ طبقہ وارانہ منافرت اور نزاع کا تحفہ دے گا۔ اب تک جہاں ہندو اور مسلمان کے جھگڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کے سر پھاڑتے اور گھر جلاتے رہے ہیں وہاں اب روٹی کے جھگڑے کی بنا پر وہی لوگ کشت وخون کرنے لگیں گے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف اسی طرح نفرت اور غصے سے بھڑک اٹھے گا جس طرح آج ایک فرقہ دوسرے فرقے کے خلاف بھڑکا ہوا ہے۔ فرقہ پرستی اور قوم پرستی کی جگہ طبقاتی مفاد کی پرستاری لے لی گی اور انصاف کے حقیقی جذبہ سے دل جس طرح آج قومی جنگ کے زمانے میں خالی ہیں اسی طرح اس وقت طبقاتی جنگ کے زمانہ میں بھی خالی ہوں گے۔ برسر اقتدار طبقے محروم طبقوں کو محروم رکھنے کے لیے لڑیں گے، اور محروم طبقے ان کی جگہ لے کر انھیں محروم

کر دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ اس طرح ہندوستان ایک مدت تک امن کی صورت کو ترستا رہے گا، اور آخر کار اگر خدانخواستہ اشتراکی انقلاب کامیاب ہو گیا تو مزید ایک طویل مدت تک یہاں روس کی طرح اونچے طبقوں کو ان کی زمینوں، جائدادوں اور کارخانوں سے بے دخل کرنے کے لیے سخت کشت و خون اور ظلم و جور کا بازار گرم رہے گا۔ پھر اشتراکی نظام قائم ہو جانے کے بعد ویسی ہی ڈکٹیٹر شپ یہاں بھی قائم ہو گی جیسی روس میں ہے۔ اسی طرح ملک کی پوری آبادی کو ایک جابرانہ اور ہمہ گیر (Totalitarian) اقتدار کے شکنجے میں کس دیا جائے گا، اسی طرح لوگ زبان اور قلم اور خیال کی آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اسی طرح تمام لوگوں کا رزق چند لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے گا، اور اسی طرح بندگان خدا کو اتنی آزادی بھی حاصل نہ رہے گی کہ اس نظام کی سختیوں سے دل برداشتہ ہوں تو کچھ چیخ پکار کریں، یا اس حالت کو بدلنے کے لیے کوئی سیاسی تنظیم اور اجتماعی کوشش کر سکیں ــــ اور ان سب سے بڑھ کر اس اشتراکی انقلاب سے جو نقصان ہندوستان کو پہنچے گا وہ یہ ہے کہ پچھلی صدیوں کے انحطاط کے باوجود جو تھوڑی بہت روحانی اور اخلاقی قدریں ہندوستان کی تہذیب میں باقی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی اور یہ ملک سراسر ایک مادہ پرست ملک بن کر رہ جائے گا۔

اس انجام سے اگر کوئی چیز ہندوستان کو بچا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ کوئی گروہ ایک ایسے نظام فکر و عمل کو لے کر اٹھے جس میں اعلیٰ درجہ کی اور حقیقی روحانی و اخلاقی قدریں بھی ہوں، سچائی اور بے لاگ اجتماعی انصاف بھی ہو، اصلی جمہوریت ــــ محض سیاسی ہی نہیں بلکہ تمدنی و معاشرتی جمہوریت (Sacial democracy) ــــ بھی ہو، اور تمام باشندگان ملک کے لیے بلا امتیاز طبقہ و نسل انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ترقی کے یکساں مواقع بھی ہوں۔ جو ایک یا چند طبقوں کے مفاد کو نہیں بلکہ سب انسانوں کے مفاد کو یکساں ہمدردی اور انصاف کی نظر سے دیکھے، کسی کا حمایتی اور کسی کا دشمن نہ ہو، طبقوں اور گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے اور لڑانے کے بجائے ایک مبنی بر انصاف نظام زندگی پر انھیں متحد کرے، محروم طبقوں کو

وہی کچھ دلائے جو ان کا فطری حق ہے اور اونچے طبقوں سے صرف وہی کچھ لے جو ان کے پاس ان کے فطری حقوق سے زائد ہے۔ ایسے ایک نظام کو اگر ملک کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کو پیش کرنے والے وہ لوگ ہوں جن کی سیرت اور اخلاق پر اعتماد کیا جا سکے، جو خود کسی قسم کی قومی یا طبقاتی یا ذاتی خود غرضی میں مبتلا نہ ہوں، جن کی اپنی زندگیاں اس بات پر گواہ ہوں کہ درحقیقت انہی سے انصاف کی امید وابستہ کی جا سکتی ہے، اور جن میں دیانت اور انتظام دنیا کی صلاحیت دونوں جمع ہوں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے اس نظام کے مقابلہ میں اشتراکی انقلاب کے راستے کو ترجیح دیں۔ اشتراکی انقلاب تو ایک آپریشن ہے جو مرض کے ساتھ تندرستی کے بھی ایک بڑے حصے کو کاٹ پھینکتا ہے، اور انسان اسے صرف ایسی مجبوری کی حالت ہی میں گوارا کیا کرتا ہے جب دوا سے مرض کی اصلاح ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہے۔ دنیا میں جہاں بھی کسی ملک کے لوگوں نے اس آپریشن کے طریقے کو اختیار کیا ہے اسی وجہ سے کیا ہے کہ ان کے سامنے ظالمانہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان کوئی تیسرا ایسا راستہ تھا ہی نہیں جس میں وہ ان دونوں کی خرابیوں سے بچ کر انصاف پا لینے کی امید کر سکتے۔ اگر اس قسم کا تیسرا راستہ پیش کر دیا جائے —— جیسا کہ پیش کرنے کا حق ہے —— تو نہ ہندوستان کے لوگ ایسے پاگل ہیں اور نہ دنیا کے دوسرے ملکوں کی آبادی ہی کو اس قدر دیوانہ فرض کرنے کی کوئی وجہ ہے کہ وہ ایک کارگر دوا کو آزمانے کے بجائے خواہ مخواہ آپریشن ہی پر اصرار کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ آیا مسلمان یہ تیسرا راستہ پیش کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر پیش کر سکتے ہیں اور اس تیسرے راستے کا نام اسلام ہی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مستقبل کے ہندوستان میں اشتراکیت کے بالمقابل اسلام کے لیے کامیابی کے کم از کم ۹۰ فیصدی امکانات ہیں۔ یہ مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی اور سخت نالائقی ہوگی کہ ان کے پاس اسلام جیسا ایک کامل اور صحیح نظام موجود ہو اور پھر وہ اسے لے کر اٹھنے کے بجائے پورا میدان اشتراکیت کے لیے خالی چھوڑ دیں۔

اب میں آپکو مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ ہندوستان میں اسلامی انقلاب کا راستہ ہموار کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔

(۱) سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اُس قومی کشمکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ بات پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لیے کام کرنے کے بجائے اپنے قومی اغراض اور مطالبوں کے لیے لڑتے رہے۔ مگر اب تو اس لڑائی کو جاری رکھنا محض غلطی نہیں بلکہ مہلک غلطی اور احمقانہ خودکشی ہے۔ اب یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمان اپنے طرزِ عمل کو بالکل بدل دیں۔ یہ اسمبلیوں میں نمائندگی کے تناسب کا سوال، یہ انتخابات کی دوڑ دھوپ، یہ ملازمتوں کے لیے کشمکش، اور یہ دوسرے قومی حقوق اور مطالبوں کے لیے چیخ پکار آئندہ دور میں لاحاصل ہوگی اور نقصان دہ بھی۔ لاحاصل اس لیے کہ اب جن لوگوں کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت آرہی ہے وہ مخلوط انتخابات اور ملازمتوں میں صرف "قابلیت" کے لحاظ کا اصول مقرر کر کے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی ہستی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور ان کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جا سکتا۔ نقصان دہ اس لیے کہ ان "حقوق" کے استقرار کی جتنی کوشش بھی مسلمان کریں گے وہ ہندوؤں کے قومی تعصب کو اور زیادہ مشتعل کرے گی، اور اگر وہ اپنی شکایات کو رفع کرانے کے لیے پاکستان کی مدد حاصل کرنا چاہیں گے تو یہ بین الاقوامی پیچیدگی اور کشمکش کا سبب بن جائے گا جس سے ہندو قوم پرستی کو زندگی کی مزید طاقت مل جائیگی۔ لہٰذا اب ہمیں وسیع پیمانے پر مسلمانوں میں ایسی رائے عام تیار کرنی چاہیے کہ وہ بحیثیت ایک قوم کے حکومت اور اس کے نظام سے بے رخی اختیار کرلیں اور ہندو قوم پرستی کو اپنے طرزِ عمل سے یہ اطمینان دلا دیں کہ میدان میں کوئی دوسری سیاسی قومیت اس کے ساتھ کشمکش کرنے کے لیے موجود نہیں ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے اس غیر معمولی تعصب کو ختم کر دینے کا جو اس وقت غیر مسلم اکثریت کے اندر اسلام کے خلاف پیدا ہو گیا ہے، اور اسی طریقے سے غیر مسلموں کے اس اندیشے کو بھی دور کیا جا سکتا ہے کہ اگر اسلام کو مزید اشاعت کا موقع دیا گیا تو کہیں پھر کسی علاقے کے مسلمان ایک اور

پاکستان مانگنے کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں۔

(۲) دوسرا اہم کام ہمارے لیے یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر اسلام کا علم پھیلائیں، ان میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عام جذبہ پیدا کر دیں، اور ان کی اخلاقی و تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اس حد تک اصلاح کر لیں کہ ان کے ہمسایہ غیر مسلموں کو خود اپنی سوسائٹی کی بہ نسبت ان کی سوسائٹی صریحاً بہتر محسوس ہونے لگے اور ان میں سے جو لوگ بھی اس سوسائٹی میں شامل ہونے کے لیے آمادہ ہوں، خواہ وہ کسی طبقے کے ہوں، ان کو بالکل مساویانہ حیثیت سے اپنے اندر لیا جا سکے۔ یہ کام برسوں کی ان تھک اور لگاتار محنت چاہتا ہے۔ مگر جب تک ہم مسلم سوسائٹی کے ایک بڑے حصہ کو علمی و عملی اور تمدنی و معاشرتی حیثیت سے اسلام کا صحیح نمائندہ نہ بنا لیں ہمارا یہ امید کرنا محض ایک بوالفضولی ہے کہ ہندوستان کی عام غیر مسلم آبادی کی رائے کو اسلام کے حق میں ہموار کیا جا سکے گا۔ غیر مسلموں کے سامنے آپ کاغذ پر یا تقریر میں اسلام کو کیسے ہی دلپذیر انداز سے پیش کریں، بہر حال وہ ان کو اپیل نہیں کر سکتا کیونکہ اسلام کے اصلی نمائندوں کا جو تجربہ انھیں رات دن کی زندگی میں ہوتا ہے وہ آپ کے بیان کی تصدیق نہیں کرتا۔ پھر اگر ان میں کوئی ایسا حق پسند نکل بھی آئے کہ مسلمانوں کے بجائے اسلام کو دیکھ کر اسے قبول کر لے، تو موجودہ مسلم سوسائٹی میں اس کا کھپنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے کہ یہاں ابھی تک قدیم ہندوانہ جاہلیت کے موروثی تعصبات، اونچ نیچ کے امتیازات، ذات برادری کے تفرقے، اسلام میں آجانے کے باوجود جوں کے توں محفوظ ہیں اور اس بنا پر ایک نو مسلم کو پھر انہی معاشرتی خرابیوں سے سابقہ پیش آتا ہے جنھیں چھوڑ کر وہ ہندو سوسائٹی سے نکلا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کی ——— اگر سب کی نہیں تو کم از کم ان کے ایک معتد بہ حصہ کی ——— اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کے بغیر دعوت اسلامی کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ محض نو مسلموں سے ہم ایک الگ سوسائٹی بنا سکیں۔ اس اصلاح میں اگر ہم کسی حد تک بھی کامیاب ہو جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اسلام سے عام واقفیت بھی پیدا کر دیں اور ان کے اندر یہ جذبہ بھی ابھار دیں کہ رات دن کی زندگی میں ان کو ہر جگہ

غیر مسلموں سے جو سابقہ پیش آتا ہے اس میں وہ حسب موقع ان کے سامنے اسلام کو پیش کرتے رہیں، تو دعوت کی رفتار اتنی تیز ہو سکتی ہے کہ ہندوستان میں کوئی دوسری تحریک اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد چار پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ اس تعداد کا بیسواں حصہ بھی اگر اسلام کو جانتا ہو اور اس کی تبلیغ شروع کر دے، تو اسلام کے مبلغوں کی تعداد ۲۰، ۲۵ لاکھ کے لگ بھگ ہو گی۔ کیا کوئی دوسری تحریک ایسی موجود ہے جس کے پاس اتنے مبلغ ہوں؟ پھر مسلمان ہندوستان کی آبادی میں کھچڑی کی طرح غیر مسلموں کے ساتھ ملے جلے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں ہر جگہ ہر وقت انھیں دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے اور اپنے برتاؤ کا اثر ڈالنے کا موقع ملتا ہے۔ کیا کسی دوسری تحریک کو یہ مواقع حاصل ہیں؟ پھر دوسری کسی تحریک کی اپنی کوئی مستقل سوسائٹی اور اپنا کوئی تمدنی نظام نہیں ہے۔ ان کے دامن میں پناہ لے کر ہندوستان کے بسنے والے اور دبے ہوئے طبقے کچھ اپنے پیٹ کے مطالبے تو پورے کر سکتے ہیں مگر اپنی معاشرتی زندگی کی مشکلات اور خرابیاں رفع نہیں کر سکتے۔ بخلاف اس کے مسلمان اپنی ایک مستقل سوسائٹی رکھتے ہیں جو اگر ہمارے نصب العین کے مطابق کچھ بھی اصلاح یافتہ ہو جائے تو تمام ان لوگوں کے لیے پوری پناہ گاہ بن سکتی ہے جنھیں معاشرتی زندگی میں پست بنا کر رکھ دیا گیا ہے، یا جن کو جاہلی نظام تمدن و معاشرت کی دوسری خرابیوں نے پریشان کر دیا ہے۔

(۳) تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ ہم اس ملک کی ذہنی طاقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنی اس دعوت کے لیے فراہم کریں، اور اس سے باقاعدگی کے ساتھ کام لیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے اُن مقاصد میں ناکام ہو چکا ہے جن پر اس نے اب تک نظر جما رکھی تھی۔ اس ناکامی کا شعور حاصل ہوتے ہی اس پر یاس طاری ہونی شروع ہو جائے گی۔ اس موقع پر اگر ان کے سامنے ایک روشن نصب العین امیدوں اور بشارتوں کے ساتھ آئے تو وہ ان کے ایک بڑے حصہ کی توجہات اپنی طرف کھینچ لے گا۔ اس طرح جیسے جیسے ہماری دعوت کو یہ طاقت حاصل ہوتی جائے، ہم چاہتے ہیں کہ اسے ان نتیجہ خیز کاموں پر لگایا جاتا رہے جو اسلامی انقلاب کو قریب تر لا سکیں۔ مثلاً ہم

مسلمانوں کی اخبار نویسی کے موجودہ رجحانات کو بالکل بدل دینا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ بہتر قسم کے اہل قلم اب انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں اخبارات جاری کریں اور ان میں سیٹوں کی چیخ پکار، ملازمتوں کے فیصدی تناسب پر شور وغل اور محکموں میں ہندو گردی پر واویلا کرنے کے بجائے رائج الوقت نظام پر اصولی تنقید کریں، اس کی خامیوں کا ایک ایک پہلو نمایاں کرکے پبلک کو دکھائیں اور اس سے بہتر ایک نظام زندگی پیش کرکے رائے عام کو اس کے حق میں ہموار کریں۔ اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان ادیب ارباب نشاط کا پیشہ چھوڑ کر اپنی ادبی قابلیتوں کو ایک اعلیٰ درجہ کا تعمیری ادب پیدا کرنے میں صرف کریں جو انسانیت کے شعور کو بیدار کرے اور ذہنوں میں ایک صالح نظام کے لیے تڑپ پیدا کردے۔ پھر جن لوگوں کو خدا نے زیادہ بلند درجہ کی دماغی صلاحیتیں دی ہیں ان کو ہم دنیا کی ذہنی امامت کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن کی مشعل ہاتھ میں لے کر علم کے ہر گوشے اور مسائل حیات کے ہر پہلو کا جائزہ لیں اور تحقیق و کاوش کے ساتھ اسلامی نظام زندگی کی پوری تصویر دنیا کے سامنے پیش کردیں جسے دیکھ کر لوگ بآسانی یہ معلوم کرسکیں کہ اگر دنیا کا انتظام اس نظام کے مطابق ہو تو اس کی تفصیلی صورت کیا ہوگی۔ ان سب کے علاوہ اسی اہل دماغ طبقہ میں سے وہ لوگ بھی نکل سکتے ہیں جو لیڈرشپ کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اسلامی دعوت کو ایک عمومی تحریک بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کو اس کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے کے لیے تیار کیا جائے۔

(۴) چوتھا ضروری کام یہ ہے کہ ہمارے سب کارکن اور وہ تمام لوگ جو آئندہ ہماری تحریک سے متاثر ہوں، ہندوستان کی ان مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تحریر و تقریر کی قابلیت بہم پہنچائیں جو آئندہ تعلیم اور لٹریچر کی زبانیں بننے والی ہیں۔ نیز اس امر کی انتہائی کوشش کریں کہ ان زبانوں میں جلدی سے جلدی اسلام کا ضروری لٹریچر منتقل کردیا جائے۔ جنوبی ہند میں تامل، تلنگی، کنہڑی ملیالم اور مرہٹی، مغربی ہند میں گجراتی، مشرقی ہند میں بنگلہ اور باقی ہندوستان میں ہندی اب تعلیم کی زبانیں ہوں گی۔ یہی اپنے اپنے علاقوں میں دفتری اور سرکاری زبانیں بھی ہوں گی اور انہی میں

ملک کا لٹریچر شائع ہوگا۔ اگر مسلمان اپنی قومی عصبیت کی بنا پر صرف اردو تک اپنی تحریر و تقریر کو محدود رکھیں گے تو ملک کی عام آبادی سے بیگانہ ہو کر رہ جائیں گے اور ان کے پاس اپنے کروڑوں ہمسایوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔ بلاشبہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اردو زبان نہ صرف باقی رہے بلکہ فروغ پائے، کیونکہ ہمارا اب تک کا سارا سرمایۂ علم و تہذیب اسی زبان میں ہے لیکن ہم اسلام کے مستقبل کو اردو زبان کے دامن سے باندھ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر اردو زبان ملک کی عام زبان نہیں بن سکتی، اور آثار یہی بتا رہے ہیں کہ اس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہوگی، تو پھر جن جن زبانوں کو ملک میں رواج حاصل ہوگا، ہم ان سب میں اسلام کا لٹریچر مہیا کریں گے اور ان سب کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے استعمال کریں گے۔ ایسا کرنا محض غیر مسلموں ہی کی خاطر نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو بھی مسلمان رکھنے کی خاطر ضروری ہے، کیونکہ آگے چل کر مسلمان بچے درسگاہوں میں تعلیمی زبان اور درسگاہوں سے باہر سرکاری اور ملکی زبان سے اس قدر متاثر ہوں گے کہ اردو سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے گا، اور اگر ان زبانوں میں کافی اسلامی لٹریچر نہ ملا تو وہ بالکل اکثریت کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے۔

یہ چار کام ایسے ہیں جن پر ہمیں آئندہ پانچ سال میں اپنی پوری قوت صرف کرنی ہے۔ بعد کے مراحل میں اسلامی انقلاب کو آگے بڑھانے کے لیے جو کچھ کرنا ہوگا، اس کا ذکر اس وقت فضول ہے۔ اس کا جب موقع آئے گا تو حسب ضرورت ہدایات جاری کر دی جائیں گی۔ مگر خوب سمجھ لیجیے کہ آگے کے کسی پروگرام کی نوبت اس وقت تک آ ہی نہیں سکتی جب تک یہ چار کام کسی معتدبہ حد تک انجام پا جائیں۔ اس لیے ہندوستان میں ہمارے ارکان جماعت اور کارکن ہمدردوں کو اپنے تمام ذرائع اور اپنی پوری قوت کار اور اپنی ساری فکر و توجہ اس ابتدائی پروگرام پر صرف کر دینی چاہیے۔ اب وہ وقت ہے کہ آپ کا ایک لمحہ بھی اگر تساہل میں ضائع کریں گے تو جرم کریں گے۔ جس طوفان کی میں دس سال سے خبر دیتا رہا ہوں وہ امنڈ آیا ہے۔ اب اگر آپ نے اس کے تدارک کی فکر نہ کی تو یہ سب مسلمانوں کے ساتھ آپ کو بھی لے ڈوبے گا۔ جو حالات اب اس ملک میں پیش

آنے والے ہیں وہ آپ کے صبر کا، آپ کے عزم کا، آپ کے استقلال کا، آپ کی حکمت و دانائی کا، اور آپ کی عملی طاقت کا سخت امتحان لیں گے۔ آپ کے ایک طرف دجال کی جنت ہوگی جس میں داخل ہونے اور مدارج عالیہ پر چڑھنے کے لیے شرط لازم ہوگی کہ تیز سے تیز قوت شامہ رکھنے والے شخص کو بھی آدمی کے اندر سے اسلامیت اور اسلامی غیرت کی ذرا سی بو تک محسوس نہ ہو سکے، اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کے گرد و پیش بہت سے مسلمان اپنی دنیوی نجات کی خاطر اس شرط کو پورا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ آپ کے دوسری جانب بھوک اور ویرانی کا جھنڈا بلند ہوگا اور اس کے سایہ میں ایک دوسری جنت شداد کا خیالی نقشہ پیش کیا جائے گا جس کے عاشقوں کو قسم دی جائے گی کہ خداپرستی اور دیانت و اخلاق سے اپنے دلوں کو خالی رکھیں۔ آپ کی آنکھیں یہ بھی دیکھیں گی کہ دنیا کے بھوکے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک جم غفیر اس کی طرف دوڑ رہا ہوگا۔ ان دو جھوٹی جنتوں کے درمیان آپ اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر کھڑا پائیں گے جہاں اسلام پر جمنے والوں اور اس کے لیے کام کرنے والوں کو ترقی و خوشحالی تو درکنار، زندگی کا سامان بھی مشکل ہی سے میسر آئے گا۔ ان کو ہر ہر قدم پر ہمت شکن حالات سے سابقہ پڑے گا۔ ان کی غیرت اسلامی اور عزت نفس کو ہر وقت چرکے لگیں گے۔ شعائر اسلامی کو وہ نہ صرف لٹتے دیکھیں گے بلکہ ان کی اہانت بھی علانیہ ہوگی اور بعید نہیں کہ مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں ہو۔ ان حالات میں صرف وہی لوگ اسلامی انقلاب کے لیے کام کر سکیں گے جو غیر معمولی صبر و ثبات، انتہائی سرگرمی، اور غایت درجہ کی حکمت و دانشمندی سے بہرہ ور ہوں۔ یہ تین خصوصیات اگر آپ اپنے اندر پیدا کر لیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس طوفان کا رخ پھیر دینے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی۔ اب اپنے دلوں کے فرق اور مزاجوں کے اختلافات کو رفع کر کے ایک بنیان مرصوص بن جائیے تاکہ آپ کی پوری اجتماعی طاقت اس کام میں صرف ہو۔ اب اپنے شیخ نفس کا استعمال کر ڈالیے کیونکہ اس کام کے لیے آپ کو کہیں باہر سے ذرائع نہ ملیں گے بلکہ سارے ذرائع آپ کو اپنے اندر ہی سے فراہم کرنے پڑیں گے۔ اب اپنے ان سب مشاغل اور دلچسپیوں کو ختم کر دیجیے جن کے اندر آپ کے وقت اور فکر کا کوئی

حصہ اس کام سے بست کر صرف نہ ہوتا ہو، اور ناگزیر معاشی ضروریات کے ماسوا اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ اسی کام کے لیے وقف رکھیے۔ آپ کی مٹھی بھر جماعت کو آئندہ پانچ سال میں — ایسے پانچ سال جو اسلام اور مسلمانوں اور خود آپ کے حق میں فیصلہ کن ہیں — بہت بڑا کام کرنا ہے اتنا بڑا کام جو پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ آپ کو مسلمانوں کی رائے عام اور ان کے قومی رویے کا رخ بدلنا ہے۔ آپ کو عامۂ مسلمین کی اعتقادی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح کرنی ہے آپ کو مسلمانوں کے اہل دماغ طبقے میں نفوذ کرنا اور اسے ذہنی و عملی انتشار سے بچا کر اسلامی انقلاب کی راہ پر لگانا ہے۔ آپ کو ملک کے مختلف حصوں کی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا انتظام کرنا ہے۔ اور یہ سارے کام محض خدا کے بھروسے اور اپنے بل بوتے ہی پر کرنے ہیں۔ کہیں سے کوئی مدد ملنے یا ہمت افزائی ہونے کی امید نہیں ہے۔ اگر آپ کمر ہمت باندھ کر کھڑے نہ ہوں گے اور پورے انہماک کے ساتھ اپنی ساری اجتماعی طاقت صرف نہ کریں گے تو یہ کام کیسے انجام پائیں گے۔ اللہ سے جو عہد کر کے آپ جماعت میں داخل ہوئے ہیں اسے یاد کیجیے، اپنے ایمان کی طاقت کو تازہ اور مضبوط کیجیے، اور صرف اللہ کی مدد کے بھروسے پر کام کے لیے آگے بڑھیے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے رب کی خوشنودی کے لیے جب کام کریں گے تو وہ بھی آپ کو ایسے ایسے راستوں سے مدد پہنچائے گا جدھر آج آپ کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔

اجلاس پنجم، بروز ہفتہ، ۲۶ اپریل ۴۷ء یہ اجلاس نماز عصر کے بعد شروع ہوا اور مغرب تک رہا اس اجلاس میں صرف ارکان جماعت شریک ہوئے، کیونکہ اس میں صرف وہ امور زیر بحث آنے والے تھے جن کا تعلق جماعت اور ارکان کے آپس کے تعلقات اور معاملات سے تھا۔ سب سے پہلے صوبہ مدراس کے بعض ارکان کی باہمی شکایات اور رنجشوں کی تحقیق کی گئی اور انھیں رفع کیا گیا۔ پھر جماعت بابا پور کا معاملہ لیا گیا جس کے ساتھ مولوی عنایت اللہ صاحب ندوی کا عرصہ سے جھگڑا چلا آ رہا تھا۔ اس کی بہت تفصیلی تحقیق کی گئی اور اجتماع سے پہلے کمیشن کے ذریعہ جو تحقیقات کی گئی تھی اس کی رپورٹ بھی امیر جماعت اور ارکان کے سامنے پیش کر دی

گئی۔ اس کے بعد امیر جماعت نے یہ معاملہ ارکان جنوبی ہند کے سامنے مشورے کے لیے پیش کیا۔ بعض ارکان نے رائے دی کہ مولوی عنایت اللہ صاحب کو مشورہ دیا جائے کہ وہ کچھ مدت جماعت سے الگ رہ کر کام کریں، جب ان کے طرزِ عمل کے بارے میں جماعت کو اطمینان ہو جائے، تو انھیں دوبارہ لے لیا جائے۔ اس مشورے کو امیر جماعت نے پسند کیا اور مولوی عنایت اللہ صاحب کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ وہ جماعت سے الگ ہو کر اپنے طرزِ عمل پر غور کریں اور اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں جس کو انھوں نے منظور کر لیا۔

مغرب کے وقت اس اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی اور اجتماع کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا۔

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

- الجہاد فی الاسلام ۵/-/-
- رسالہ دینیات ۱/۸/-
- حقوق الزوجین ۱/۸/-
- مسئلہ قومیت ۱/۸/-
- مسئلہ جبر وقدر ۱/-/-
- تجدید و احیائے دین ۱/-/-
- اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر ۱/-/-
- قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ۱/۴/-
- سیاسی کشمکش حصہ اول ۱/۴/-
- سیاسی کشمکش حصہ دوم ۲/۸/-
- سیاسی کشمکش حصہ سوم ۲/-/-
- پردہ ۲/۸/-
- تنقیحات ۲/۸/-
- خطبات ۲/۴/-
- تفہیمات ۳/۸/-
- حقیقت توحید ۱/۴/-
- اسلام اور ضبط ولادت -/۱۲/-

- ہیگل مارکس اور نظام اسلام ۲/۸/-
- رسالہ دینیات (انگریزی) ۳/۸/-
- اسلام کیا ہے (انگریزی) ۱/۸/-
- ایمان کے بعد کیا (") -/۱۲/-
- سلامتی کا راستہ -/۶/-
- اسلام کا نظریہ سیاسی -/۶/-
- اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے /۶/-
- انسان کا معاشی مسئلہ -/۶/-
- اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر -/۶/-
- نیا نظام تعلیم /۶/-
- دین حق -/۶/-
- اسلام اور جاہلیت -/۶/-
- ایک اہم استفتا -/۲/-
- دستور جماعت اسلامی -/۲/-
- روداد جماعت اسلامی حصہ اول -/۱۰/-
- روداد جماعت اسلامی حصہ دوم -/۹/-
- روداد جماعت اسلامی حصہ سوم ۱/-/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

دارالاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)

مطبوعہ دین پریس، لاہور